خاموش صدائیں

(افسانے)

ڈاکٹر رینو بہل

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ اُتّر پردیش حکومت ہند کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

KHAMOSH SADAYEN

(Short Stories)

by

Dr. Renu Behl

Year of Edition 2013
ISBN 978-93-5073-182-6
₹ 200/-

نام کتاب	:	خاموش صدائیں
مصنفہ وناشر	:	ڈاکٹر رینو بہل
سنہِ اشاعت	:	۲۰۱۳ء
قیمت	:	۲۰۰ روپے
مطبع	:	عفیف پرنٹرس، دہلی۔۶

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

فہرست

☆☆

انتساب

اُن بچیوں کے نام

جن سے اُن کے اپنوں نے انہیں

اس دُنیا میں آنے کا

حق چھین لیا۔

خمیدہ سروں کی جستجو

ستمبر کی ایک سُہانی شام، صُبح کی ہلکی ہلکی بارش نے موسم کو خوشگوار بنا دیا تھا۔ لوگ سُکھنا جھیل پر موسم کا مزا لینے اُمڈ پڑے تھے۔ جھیل کے اُس پار گھنا جنگل اور اُس کے پیچھے سینا تانے کھڑی لشوالک پہاڑیاں۔ بھیڑ سے دُور سیڑھیاں اُتر کر جھیل کے کنارے بیٹھے اُن لہراتی بل کھاتی لہروں نے بھی مسرت اور سکون میں اضافہ کر دیا تھا۔ شام ڈھل گئی فلک پر پورا چاند اپنے حُسن و جمال کے ساتھ روشن ہو گیا۔ جھیل کے اُس پار کسولی کی پہاڑیوں پر ٹمٹماتی روشنیاں جھیل میں دکھتا چاند کا عکس مجھے اِس قدر محو کر گیا کہ میں اپنے ہی وجود سے ان بھیگ ہو گئی۔ کسی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"تم وہی ہو نہ جو افسانے لکھتی ہو۔"

"افسانے تو میں لکھتی ہوں۔ کہو کیا بات ہے؟"

"میں جاننا چاہتا ہوں تم افسانے کیوں لکھتی ہو؟"

"یہ بات تو میں خود سے کئی بار پوچھ چکی ہوں۔ بہت سوچنے پر یہ سمجھ میں آیا کہ میں کسی کے لیے نہیں بلکہ خود کے لیے لکھتی ہوں"

"خود کے لئے؟ وہ کیوں؟"

"کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے ذہن کی تہہ در تہہ کے اندر ایک دریا بہتا ہے جس میں کبھی ماضی کی یادیں، کبھی حال کے در پیش آنے والے مسائل، کبھی ارد گرد کا

ماحول، کبھی کھُلی آنکھوں سے دیکھے خواب تو کبھی ادھوری خواہشوں کی موجیں اُٹھتی ہیں، ٹکراتی ہیں، دل پر دستک دیتی ہیں اور کبھی کبھی اُن کی رفتار اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ خیال کی کڑی جڑ پکڑ لیتی ہے۔ پھر وہ خیال مسلسل دستک دینے سے ذہن کے ایک گوشے میں عارضی گھر بنا لیتا ہے۔ چلتے پھرتے، سوتے جاگتے وہ جڑ پنپنے لگتی ہے اُس سے مختلف کردار اپنی صورتیں لئے ابھرنے لگتے ہیں اور اپنی ایک دُنیا بسا لیتے ہیں۔ پھر جب اُن کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور وہ پودا پھول بن کر کھِل اُٹھتا ہے تو اپنی مختصر سی زندگی کو بھرپور جینے کے لئے دباؤ ڈالنے لگتا ہے۔ اور اِس دباؤ سے بڑھتی بے چینی سے نجات پانے کے لئے اس پھول کے مُرجھانے سے پہلے اُسے توڑ کر اُس پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر ذہن سے کاغذ پر اُتار دیتی ہوں۔ وہ گوشہ کسی دوسرے خیالات کے لئے خالی ہو جاتا ہے جیسے ایک کرایہ دار نے دوسرے کے لئے وہ گھر وہ کمرہ خالی کر دیا ہو۔ جب اُس پھول کا وجود کاغذ پر سمٹ جاتا ہے تو مجھے راحت محسوس ہوتی ہے۔ اِسی لئے کہتی ہوں میں افسانے خود کے لئے لکھتی ہوں۔"

"کہنے والے کہتے ہیں تمہاری کہانیاں ہمیشہ رشتوں کے ارد گرد ہی گھومتی ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

"ہم یہ کہتے ہیں کے ادب زندگی ہے اور زندگی رشتوں کے بغیر بے معنی ہے اس لئے تینوں کا رشتہ گہرا ہے۔ صدیوں سے رشتوں پر ہی تو لکھا جا رہا ہے۔ وقت کے ساتھ معاشرے کے حالات بدلتے ہیں۔ قدریں بدلتی ہیں، تہذیب بدلتی ہے مگر رشتے تو ہمیشہ موجود رہتے ہیں صرف ان کی گرماہٹ یا وقار میں ہی تبدیلی آتی ہے۔ کِسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

بنائے جاؤ محبت کے لاکھ افسانے

جنوں وہی ہے دیوانے بدلتے رہتے ہیں

کہانیاں تو وہی ہیں صرف لکھنے والے کا اندازِ بیان مختلف ہوتا ہے۔ رشتے تو ہر کہانی میں ہوتے ہیں صرف اُن کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔"

''تم خود ایک عورت ہو پھر بھی تم عورتوں کے کردار کی خامیاں کیوں بیان کرتی ہو''؟

''میں عورت ہوں اسی لئے عورت کی خامیاں، اُس کی خوبیاں، اُس کی کمزوریاں، اُس کی طاقت، اُس کی نفسیات، اُس کی فطرت سے بخوبی واقف ہوں۔ عورت صنفِ نازک بھی ہے، ایک لحاظ سے نصف بہتر بھی ہے اور ایک طرح سے مرد کو جنت سے نکلوانے والی بھی۔ عورت کا ایک پہلو اُس کے قدموں تلے جنت کا بھی ہے۔ ایک مغربی مفکر نے کیا خوبصورت بات کہی ہے

''عورت زمین پر فطرت کی شاعری ہے اسی طرح جس طرح
آسمان پر ستارے قدرت کے اشعار کی مانند ہیں۔''

کہتے ہیں جب عورت نفرت کرتی ہے تو مرد کو اُس سے ڈرنا چاہیے کیونکہ مرد کے دل میں بدی ہوتی ہے اور عورت کے دل میں اُس کے خلاف جذبہ۔ اسی لئے میرے افسانوں کی عورت خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ کہانیوں میں اُبھرتی ہے۔''

''میں نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ لوگ تم سے اکثر پوچھتے ہیں کہ غیر مسلم ہو کر تم اردو میں کیوں لکھ رہی ہو جب کہ تمہاری مادری زبان پنجابی ہے؟''

''مجھے ایسے لوگوں کی سوچ پر حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ زبان، ادب اور محبت کا کیا کوئی مذہب ہوتا ہے؟ یہ تو ہر قید سے آزاد ہیں یہ تو وہ خوش رنگ ہوا ہے جس نے اِسے چھولیا اُسی کی ہوگئیں۔ کم ظرف لوگ اِسے کبھی مذہب کبھی سرحدوں کے دائرں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔''

اُس نے دھیرے سے مُسکراتے ہوئے ایک اور سوال چھوڑا:۔

''لوگ کہتے ہیں تمہاری کہانیاں Craftsmanship کے ہُنر سے محروم ہیں اور کسی بھی کہانی کا حُسن افسانہ نگار کی Craftsmanship سے ہی نکھرتا ہے۔''

''لوگ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔ دراصل میں ایک جذباتی انسان ہوں اور جذباتی فطرت والے لوگ دماغ سے نہیں دل سے سوچتے ہیں۔ میں سوچتی بھی دل سے

ہوں لکھتی بھی دل سے ہی ہوں اور جس دن میں دماغ سے لکھنا شروع کر دوں گی، شاید اُس وقت یہ ہُنر بھی حاصل کرلوں۔''

''میں یہ دل سے دُعا کروں گا کہ رب آپ کو اس ہُنر سے نوازے اور۔۔۔''

میں نے اُسے بیچ میں ہی ٹوک دیا

''یہ تمہاری ذرّہ نوازی ہے کہ تم میرے لئے دعا کر رہے ہو مگر مجھے خوشی ہوگی اگر اس دُعا سے پہلے تم یہ دعا کرو کہ ہمارے گھروں، شہروں، ملک اور پوری دُنیا کی ماں بیٹیوں کو آزاد، پُرسکون اور محفوظ ماحول ملے، اُنہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ اُنہیں کوکھ کے اندر اور کوکھ کے باہر عزت سے جینے کا حق مل سکے۔ اس وقت سب سے بڑی اسی دعا کی ضرورت ہے۔''

ہم دونوں کبھی نہ ختم ہونے والی گفتگو میں محوے تھے کہ مجھے کچھ منچلے نوجوانوں کی پھبتیوں نے چونکا دیا۔ میں نے اپنے ارد گرد دیکھا میں بالکل تنہا تھی وہ کہیں نہ تھا اور رات کی سیاہی چار سو پھیل چکی تھی۔ ماحول کی نزاکت سمجھتے ہوئے میں تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر لوگوں کے ہجوم میں شامل ہوگئی۔ میرے کانوں میں وہ پھبتیاں سیسے کی طرح پگھل رہی تھیں اور اپنی پُشت پر جمی شراریں بھری نگاہیں مجھے اس بات کا احساس دلا رہی تھیں کہ وہ ہوس بھری نگاہیں میرا پیچھا کر رہی ہیں اور مجھے جلد ہی محفوظ جگہ پہنچ جانا چاہیے۔ میرے قدم اور تیز ہوگئے اور ذہن اس سے بھی تیز اڑنے لگا اُس سنہرے مستقبل کی اور جہاں آنے والی بیٹیوں کی نسل کے لئے پُرسکون، محفوظ، آزاد ماحول ہوگا جب اس دنیا میں آنے پر اُن کا استقبال ہوگا اور وہ بے خوف آزاد پرندے کی طرح اپنی اُڑان بھر سکے گیں۔ کاش! ان جاگتی آنکھوں کا یہ خواب جلد ہی سچ ہو جائے۔

(آمین)

☆☆

موہ جال

کملا کی عمر تقریباً پچپن سال کی ہوگی مگر اس کے چہرے کی جھریاں، بالوں کی سفیدی، دبلا پتلا جسم اور جھکی ہوئی کمر اس کی عمر کو جھٹلا رہے تھے۔ جب وہ پہلی بار آشا ورما کے گھر کام مانگنے آئی تھی اس وقت اس کی عمر بیس کے قریب ہوگی۔ سیدھے پلے والی سوتی دھوتی۔ سر پر پلا کیا ہوا نہ ماتھے پر بندیا، نہ ہاتھوں میں چوڑیاں نہ پاؤں میں پازیب سہاگ کی ساری نشانیاں غائب تھیں۔ ایک چار سال کی سانولی سی دبلی پتلی بچی اس کے ساتھ چپٹ کر کھڑی تھی ایک نظر میں ہی اس کی بے بسی لاچاری اور زندگی کی مجبوری اس کے چہرے کے کرب اور اس کے پیکر سے نمایاں ہوگئے۔ چند روز پہلے ہی گاؤں سے کام کی تلاش میں آئی تھی۔ کسی دور کے رشتے دار نے سہارا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں روزی روٹی ملنے کی امید کو وہ بجھا نہ سکی۔ ماں بیٹی کا خستہ حال دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا تھا۔

’’کیا کام کر سکتی ہو؟‘‘

’’آپ جو بھی کہیں گی وہ کروں گی‘‘

’’یہ بیٹی ہے تمہاری؟‘‘

’’جی! یہ ممتا ہے بس یہ ہی میرے جینے کا سہارا ہے۔‘‘

’’تمہارا پتی؟‘‘

’’اسے گزرے سال ہوگیا۔ ساس سسر نے گھر سے نکال دیا کہ اپنا بوجھ خود اٹھاؤ

اب کام کی تلاش ہے۔‘‘

’’رہتی کہاں ہو؟‘‘

’’یہ جو پاس ہی جھونپڑ پٹی ہے وہیں اپنے رشتے دار کے ساتھ رہتی ہوں۔ آپ کام دیں گی تو کوئی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔‘‘

اسی روز سے اس نے اس کے یہاں کام شروع کر دیا۔ دو تین روز میں ہی وہ سارا کام سیکھ گئی۔ صبح سویرے ہی وہ کام پر آجاتی۔ اس کی بیٹی آنگن میں کھیلتی رہتی اور وہ دل لگا کر کام کرتی رہتی۔ اس کی ایمانداری اور لگن دیکھ کر آشا ورما نے تین چار گھروں کا اور کام دلا دیا۔ روٹی سبزی، کپڑا جو بھی بن پڑتا وہ کملا کو دیتی رہتی۔ آشا ورما کی بیٹی سریوں اور ممتا ہم عمر تھیں۔

جب سریوں اسکول جاتی تو وہ بڑی حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا کرتی۔ ایک دو بار آشا ورما نے کملا سے بچی کو پڑھانے کے بارے میں بات کی تو وہ راضی نہیں ہوئی۔

’’نہیں میم صاحب یہ کچھ دنوں میں میرے ساتھ ہی کام کرے گی۔ میں نے اس کو اسکول نہیں بھیجنا۔‘‘

اس کے انکار کے باوجود ممتا سریوں سے کتابیں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھتی۔ پھر سریوں نے اسے پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ دوپہر کو جب کملا برتن صاف کرنے آتی تو ممتا سیدھے سریوں کے پاس چلی جاتی دونوں ایک ساتھ کھیلتی اور پھر وہ کتابیں پڑھنے کی کوشش میں لگ جاتی۔ پھر جیسے جیسے ممتا نے لوگوں کے گھر کام کرنا شروع کیا، کتابوں کے لئے وقت گھٹتا گیا۔

جوانی میں قدم رکھتے ہی اس نے ماں کا کام کم کروا دیا اور خود زیادہ گھر سنبھال لئے۔ کتابیں بہت پیچھے چھوٹ گئیں تھیں۔ کملا کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ اس نے بس دو تین پرانے گھر ہی رکھے تھے باقی سب چھوڑ دئے۔ کملا نے زمانے کی ٹھوکریں کھائیں تھیں اس لئے اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھیں بیٹی کو اس طرح سے پال

پوس کر بڑا کیا کہ وہ بھٹک نہ جائے۔ ممتا نے بھی اپنی بیوہ ماں کو کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ اس نے کبھی کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کبھی کسی سے فضول بات نہیں کی بس اپنے کام سے کام رکھا۔ لڑکی تھوڑی سیانی ہوئی تو ماں کی راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ اس نے بیٹی کے لئے تھوڑا تھوڑا کر کے دہیز تو اکٹھا کر لیا تھا بس ایک اچھے رشتے کی تلاش میں گھلی جا رہی تھی۔ آشا ورما نے بڑا سمجھایا:

''کملا ابھی ممتا صرف اٹھارہ سال کی ہوئی ہے تو اتنی فکر کیوں کر رہی ہے کہیں بوڑھی نہیں ہوئی جا رہی تیری بیٹی۔''

''آپ کو نہیں معلوم بی بی جی ہمارے یہاں تو چھوٹی عمر میں ہی لڑکی بیاہ دیتے ہیں۔ یہ تو ہم شہر میں ہیں اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میں اس کو گاؤں میں بیاہوں اسی لیے اتنی سیانی ہوگئی۔ آپ نہیں جانتی جھونپڑ پٹی میں جوان لڑکی سنبھالنا کتنا مشکل ہے۔ ایک تو گھر میں کوئی مرد نہیں دوسرا میری ڈھلتی عمر میں تو چاہتی ہوں جلد سے جلد اسے ڈولی میں بٹھا دوں۔''

فکر تو بے چاری کی جائز تھی۔ اُس کی دعائیں رنگ لائی اسے بہت اچھا رشتہ مل گیا۔ لڑکا دس پاس تھا اور سرکاری دفتر میں چپراسی تھا۔ کسی نے کملا کو اتنا خوش نہیں دیکھا تھا جتنا وہ بیٹی کی سگائی کے بعد تھی۔ ممتا کی آنکھوں میں رنگین سپنے تیرنے لگے۔ کملا کے جسم میں نئی پھرتی پیدا ہوگئی تھی۔ ہمیشہ نڈھال رہنے والی کملا اب بھاگ بھاگ کر کام کرتی جیسے اسے کوئی بیماری ہو ہی نہ۔ بہت کم بولنے والی کملا اب بیٹی کی شادی کی باتیں کرتی نہ تھکتی۔ سارے کام ختم کر کے وہ آشا ورما کے پاس پہنچ جاتی اور ایک ایک بات پر اس سے صلاح لیتی۔ شادی کے دن قریب آ رہے تھے اور اس کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ سب لوگوں سے جو جو ہو سکا انہوں نے کیا۔ اپنے چند رشتے داروں کے ساتھ وہ بیٹی کو لے کر دلی چلی گئی۔ شادی وہیں پر ہونی تھی۔ جانے سے پہلے ممتا سریوں کو مل کر بہت روئی۔ اس کے منہ سے صرف ایک ہی بات نکلی۔

''میں بھی چاہتی تھی کہ آپ کی طرح پڑھ لکھ جاؤں مگر یہ ہو نہ سکا۔''

''کوئی بات نہیں ممتا۔ پڑھائی کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔''

''ہمارے گھروں میں ایسا نہیں ہوتا۔''

پڑھائی حاصل نہ کرنے کی حسرت اُس کے دل میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

ایک ہفتے بعد کملا اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو کر لوٹ آئی۔ بہت خوش تھی کہ اس کی بیٹی کو ایک بھرا پورا پریوار مل گیا ہے اور وہ بیگانی امانت کو ٹھیک ٹھاک صحیح جگہ پر پہنچا آئی ہے۔ اب وہ بالکل اکیلی ہوگئی تھی مگر پھر بھی خوش تھی بیٹی کے سکھ کے ٹھنڈے جھونکے اس کی خوشی کی وجہ تھے۔ اب وہ اپنا زیادہ وقت آشا ورما کے گھر ہی گذارتی۔ اس کا ہاتھ بٹا دیتی اور کھانا وہیں پر کھاتی۔ کبھی کبھی تو وہ رات کو بھی وہیں رُک جاتی۔

شادی کے بعد ممتا ایک بار ہی مائکے آئی۔ وہ اپنی زندگی سے کافی خوش تھی، پتی پیار کرتا تھا ساس سسر پورا خیال رکھتے تھے۔ نند اور دیور آگے پیچھے گھومتے تھے۔ ایک سال کے اندر ہی اس نے سب کا دل جیت لیا تھا۔ جب اس نے آ کر ماں کو خبر دی کہ وہ اُمید سے ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو اُٹھا۔ خوشی اس کے چہرے پر چمک رہی تھی۔ ممتا سریوں سے بھی ملنے گئی مگر سریوں میڈیکل کالج میں داخلہ ملنے کے بعد شہر سے باہر پڑھنے جا چکی تھی۔ آشا ورما نے اسے نئے کپڑے اور شگن دے کر بدا کیا شادی کے بعد وہ پہلی مرتبہ ان کے گھر آئی تھی۔ اس نے اسے ماں بننے کی مبارکباد دی اور بہت ساری دعائیں بھی۔

''اگلی بار آؤ تو اکیلی مت آنا اپنے پتی اور ننھے منے کو بھی لے کر آنا۔ خوش رہو۔''

بیٹی کو بدا کرنے سے پہلے کملا نے اسے ڈھیر ساری ہدایتیں دے ڈالیں۔ اب اسے خوش خبری آنے کا انتظار بے صبری سے تھا۔ جیسے جیسے زچگی کے دن قریب آتے گئے اس کی بے چینی بھی بڑھتی گئی۔

''کیا کروں بی بی جی دل آج کل کسی کام میں نہیں لگتا۔ سارا دن ممتا کا ہی خیال رہتا ہے۔ پتا نہیں میری بچی کا کیا حال ہوگا۔''

"اپنی تسلی کے لئے کچھ دنوں کے لئے خود ہی چلی جاؤ اس کے پاس۔ اسے بھی آرام ملے گا اور تمہیں بھی تسلی ہو جائے گی۔"

"کیا بیٹی کے گھر جانا ٹھیک رہے گا"؟

"کیوں نہیں ماں ہو تم اس کی۔ میری مانو تو صبح ہی نکل جاؤ۔"

کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں کل صبح ہی نکل جاؤں گی۔"

"اچھی سی خبر لے کر آنا" کچھ روپے کملا کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اس نے کہا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کر کے وہ صبح ہی دہلی جانے کا ارادہ کر کے وہاں سے چلی گئی۔

ایک ہفتے کے لئے وہ گئی تھی مگر مہینے سے بھی زیادہ ہو گیا وہ لوٹ کر نہیں آئی۔ اتنے سالوں میں ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ آشا ورما کا پورا گھر اس نے سنبھال رکھا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس نے نئی کام کرنے والی رکھ تو لی مگر نہ اسے کملا جیسی لگن اور ایمانداری نظر آئی اور نہ ہی وہ اپنا پن۔ اتنے سالوں میں دونوں میں مالک اور نوکر کا نہیں بلکہ ہمدردی کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ وہ اب نوکر کم اور گھر کی ایک فرد کی طرح ہی بن گئی تھی۔

ورما صاحب اور بچے بھی اسے پوری عزّت دیتے تھے۔ ورما صاحب اکثر شہر سے باہر دورے پر رہتے۔ اور کملا اپنا سکھ دکھ انہیں کے ساتھ بانٹتی۔ اتنے دن کی اس کی غیر موجودگی اب آشا ورما کے لئے باعثِ فکر بن گئی تھی۔ تقریباً دو مہینے بعد ایک دن صبح ہی کملا اس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے صدیوں کی بیمار ہو۔ ان دو مہینوں میں ہی اس کی عمر دس سال آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ لپٹا ہوا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھتے ہی آشا ورما چونک اٹھی۔

"کملا کیا ہوا یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ سب خیریت؟" وہ اسے بازوؤں سے پکڑ کر اندر لے آئی۔ اگر وہ اُسے تھام کر اندر نہ لاتی تو شاید وہ غش کھا کر وہیں گر جاتی۔

بچے کے رونے کی آواز آئی اور اس نے جھٹ سے کملا کی ساڑی کا پلو ہٹایا۔ ایک

ننھی سی بچی کو اس کی گود میں دیکھ کر اسے سارا ماجرہ سمجھ میں آ گیا۔ کملا بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اسے پانی پلا کر ڈھارس بندھائی تو وہ کچھ بتانے کے قابل ہوئی۔

"میں جب دلّی پہنچی تو ممتا اسپتال میں داخل تھی کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹروں نے کئی روز سے اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔ ماں کا دل ایسے ہی نہیں گھبرا رہا تھا بچی کو اس حالت میں تڑپتے دیکھا ہے۔ مجھے دیکھ کر اسے بہت سکون ملا۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ ماں یا بچے میں سے ایک کو ہی بچا پائیں گے۔ مجھے اپنی بیٹی کی فکر تھی اور انہیں بچہ چاہئے تھا۔ بھگوان نے میری فریاد ٹھکرا دی مگر ان کی بھی نہیں سنی۔ انہیں بیٹا چاہئے تھا اور ممتا نے بیٹی کو جنم دیا۔"

"بیٹیاں بری تو نہیں ہوتیں۔" آشا ورما نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

"بیٹیاں بیٹوں سے زیادہ ہمدردی کرتی ہیں۔ میرے جینے کا سہارا تھی وہ۔ میرا وقت تھا جانے کا اور وہ سب چھوڑ کر چلی گئی۔ جاتے جاتے اپنی نشانی بھی میری گود میں ڈال گئی۔ بھلا اب اس عمر میں کیسے پرورش کروں گی اس بدنصیب کی۔"

"تم کیوں اس بچی کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ وہاں اس کے دادا دادی اور اس کا باپ جو ہے انہیں کے پاس رہنے دیتی۔"

"کیسے رہنے دیتی بی بی جی اس کی جگہ بیٹا ہوتا تو وہ اسے سینے سے لگا لیتے۔ باپ نے ایک بار بھی اسے گود میں نہیں اٹھایا وہ تو اس کو منحوس سمجھتا ہے۔ ابھی تو اس کی چتا کی راکھ ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے نئے رشتے تلاش کرنے شروع کر دئے۔ میں تو صرف اس بچی کی خاطر وہاں رکی رہی۔ بچی کو لے کر اس لئے چلی آئی کہ دو دن بعد ہی اس کی سوتیلی ماں آ رہی ہے۔ ان سب کے حوالے کیسے کر آتی۔" اس بچی کو گود میں لے کر وہ پھر رونے لگی۔

رونا شاید اس کا نصیب بن گیا تھا۔ نئے سرے سے زندگی شروع ہو رہی تھی۔ اب اس میں اتنی طاقت نہیں رہی کہ پھر سے ایک چھوٹے بچے کی اچھی طرح پرورش کرے۔ ایک تو عمر کا تقاضا اوپر سے غموں کی مار کملا پھر سے ہنسنا بھول گئی تھی۔ چپ چاپ

اپنا کام کرتی۔ ہمیشہ نڈھال رہتی۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے غصہ آنے لگا تھا۔ بچی کو منی پکارتے پکارتے اس کا نام بھی منی ہی پڑ گیا تھا۔ ممتا جتنی سنجیدہ تھی منی اتنی ہی چنچل۔ اس کی نانی ہی اس کی دنیا تھی۔ کملا اسے اپنے ساتھ کام پر لے جاتی اور وہ لوگوں کے آنگن میں کھیلتی رہتی۔ جیسے جیسے منی بڑھتی گئی نانی کی شکایت اور اسے کوسنا بھی بڑھتا گیا۔ وہ منی میں ممتا کی پرچھائیں دیکھتی تھی مگر وہ تو ممتا کے بالکل برعکس تھی۔ جھونپڑپٹی کے ماحول کا اثر پوری طرح اس پر پڑا تھا۔ کملا میں اب اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگے بوڑھا شریر جوان جسم کی حفاظت تو کرنا چاہتا ہے مگر اس کے لئے تیکھی نظر اور قوت بھی تو چاہئے جواب دونوں کملا کے پاس نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی۔ ایک دن اس نے آشا ورما کو آکر بتایا کہ منی گھر سے بھاگ گئی ہے۔ پتا لگانے پر معلوم ہوا کہ اس علاقے کے آوارہ لڑکے کے ساتھ بھاگی ہے۔ کملا نے بہت شور مچایا سب کو خوب بھگایا لڑکی کو تلاش کرنے کے لئے اور ایک دن وہ خود ہی لوٹ آئی۔ نانی نے ڈانٹا ڈپٹا، گالیاں بھی دیں ہاتھ بھی اُٹھایا مگر سب بے اثر۔ اسے چودھ برس کی عمر سے بھاگنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اب تو آشا ورما کو جب اس کے بھاگنے کا پتا چلتا تھا، تب کملا رات کو گھر نہیں لوٹتی تھی اور ان کے برآمدے میں ہی پڑی رہتی تھی۔ اب اس سے گھر کے کام بھی ٹھیک سے نہیں ہو پاتے تھے۔ آشا ورما نے نئی کام والی رکھ لی تھی۔ مگر کملا کو بھی نہیں نکالا تھا۔ چھوٹے موٹے کام اس سے کرواتی۔ اسے ویسے ہی تنخواہ، روٹی اور کپڑا دیتی۔ بہت سال اس نے اس گھر کی خدمت کی تھی۔

ایک صبح آشا ورما اپنے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی تھیں کہ کملا آئی، اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ بہت دنوں بعد ہلکی سی خوشی اس کے جھریوں والے چہرے پر رینگ رہی تھی۔

''آج کچھ خاص بات ہے کیا''؟

''جی بی بی جی۔ منی لوٹ آئی ہے۔ اب وہ کہیں نہیں جائے گی۔''

''اسے تو بھاگنے کی عادت ہوگئی ہے۔ پھر بھاگ جائے گی۔''

''اب نہیں جائے گی۔ وہ پیٹ سے ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''کیا۔؟ یہ تو ہونا ہی تھا۔ کس کا پاپ ہے تونے پوچھا؟''

''نہیں۔ مجھے نہیں پوچھنا مجھے نہیں جاننا۔ میں تو بس اتنا جان گئی ہوں کہ اب وہ کام کرے گی کہتی ہے اس بچے کے لئے جیے گی۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ اب جہاں وہ اس بچے کو پالے گی مجھے بھی پال لے گی۔ اب میرا بڑھاپا رُلے گا نہیں۔''

اور آشا ورما بڑھاپے کی لاچاری، مجبوری اس کی سوچ اور کملا کے نئے روپ کو دیکھتی ہی رہ گئی۔

☆☆

خاموش صدائیں

جیتی کے صحن میں خوب رونق بجی ہے۔ جوان لڑکیاں سج دھج کر مورنی کی طرح اندر باہر اٹھلا رہی ہیں۔ بچوں نے اچھل کود کر گھر کو سر پر اٹھا رکھا ہے۔ جیتی مہمانوں کی دیکھ ریکھ میں مصروف ہے۔ آج اُس کی بیٹی لاڈو کی شادی ہے۔ اُسے آشیرباد دینے گرمیت چاچی بھی پہنچی ہیں جو اس وقت اس کی ساس کے ساتھ بیٹھی اُس کی باتیں سن رہی ہے۔ سردیوں کی نرم دھوپ اُس کے بوڑھے جسم میں اکڑی ہوئی رگوں کو گرماہٹ بخش رہی ہے۔ ویسے تو وہ کہیں آتی جاتی نہیں مگر جیتی سے اُن کا ایک ان کہا رشتہ ہے اور جب وہ اسے بیٹی کی شادی کا نیوتا دینے پہنچی تو وہ نہ آنے کا کوئی بہانہ نہ بنا سکی۔ وہ جیتی میں جوگی کو تلاش کرتی تھی۔ اگر آج جوگی اس کے پاس ہوتا تو شاید یہ شادی اس کے گھر ہو رہی ہوتی۔ لاڈو شاید اُس کی پوتی ہوتی۔ اتنی رونق میں بھی تنہائی کے احساس نے اُسے جکڑ لیا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھی، کان سب باتیں سن رہے تھے پھر بھی وہ اپنے ماحول سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں گم تھی۔ اس کی سوچ اِس ہجوم سے نکل کر ایک انجان شہر میں انجان جگہ پر اپنے جوگی کے پاس پہنچ چکی تھی۔ جوگی اس کا تیسرا اور سب سے چھوٹا بیٹا اس کے جگر کا ٹکڑا گھر سے جاتے جاتے سب خوشیاں سمیٹ کر لے گیا اور اُس کی زندگی کے ساتھ ساتھ اُس کے دل کا ایک گوشہ ہمیشہ کے لیے ویران ہو گیا۔

گُرمیت نے ایک کے بعد ایک تین بیٹوں کو جنم دیا۔ سب سے بڑا رتن، منجھلا ویر

اور سب سے چھوٹا جوگی۔ تیسرے بیٹے کی پیدائش پر وہ بڑی مایوس ہوئی تھی۔ ہربنس نے بیٹے کو گود میں اُٹھاتے ہوئے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا:

''میں کہتا تھا نہ گرمیتے تیرے نصیب میں بیٹی کا سکھ نہیں ہے۔ اب اسے ہی بیٹی سمجھ لینا۔''

''ہٹو جی کیسی باتیں کرتے ہو۔ لوگ بیٹیوں کو بیٹوں کی طرح پالتے ہیں اور آپ اُلٹی گنگا بہا رہے ہو۔ رب سکھ رکھے اگلی بار بیٹی ہی دوں گی آپ کو۔''

''بس بس اب اور کی امید مت کرو۔ مہنگائی کدھر جا رہی ہے کچھ پتا ہے تجھے؟ شہر میں تو لوگ دوسرا بچہ بھی پیدا نہیں ہونے دیتے اور تو۔۔۔۔۔''

''شہر والوں کی بات مت کرو۔ آپ شہر میں صرف نوکری کرتے ہو وہ بھی آپ کی ضد ہے ورنہ ضرورت کوئی نہیں۔ ہو تو آپ گاؤں کے ہی۔ رب کی بہت کرپا ہے ہم پر۔ اتنی زمین دے رکھی ہے۔ گھر کا اناج، گھر کی سبزی، تازہ پھل، تازہ دودھ پھر ہمیں سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔؟''

''تو بس یہ دعا کر کہ ان کو اچھی تعلیم دے سکیں اور انہیں اچھے انسان بنا سکیں۔ بس یہ ہی تیری دنیا ہے۔ لے اب اسے کیا ہوا جو اتنی زور زور سے رونے لگا'' اس نے بچے کو ماں کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اسے بھی ماں کی طرح آپ کا فیصلہ پسند نہیں آیا۔''

وہ مسکرا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

جوگی کی پیدائش پر اس کی ساس جتنی خوش تھی وہ اتنی ہی مایوس۔ شروع شروع میں تو وہ اسے گود میں بھی کم ہی اٹھاتی تھی۔ مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اس کا پیار بھی بڑھتا گیا اور پھر ایسا بھی ہوا کہ وہ اس کا سب سے لاڈلا بن گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی پیاری باتیں، ننھی ننھی شرارتیں سب کے دل کو موہ لیتی تھی۔ اپنے دونوں بڑے بھائیوں سے وہ زیادہ چست، زیادہ باتونی، زیادہ مسخرہ اور زیادہ شرارتی تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ شرارتیں بھی بڑھنے

لگیں تو گھر میں ماں کے پاس شکایتیں بھی آنے لگیں۔

جو کوئی ماں کے پاس شکایت لے کر آتا اُسے ہنس کر ٹال دیتی۔

''بھلا بچے شرارتیں نہیں کریں گے تو کیا بوڑھے کریں گے۔ بچے تو شرارتیں کرتے ہی اچھے لگتے ہیں۔''

لوگوں کو تو کسی نہ کسی طرح باتوں سے بہلا کر، لسی چھاچھ پلا کر بھیج دیتی مگر جوگی کے گھر میں گھستے ہی اس کی پٹائی چھڑی سے کرتی۔ ایک چھڑی اس نے صرف جوگی کی پٹائی کے لئے الگ رکھی ہوئی تھی۔ رتن اور ویر ایک دم سے اُس کے بچاؤ کے لیے آ جاتے اور ماں سے چھڑا کر لے جاتے۔ پھر وہ رات کے کھانے سے پہلے ماں کے سامنے نہ آتا۔ جب ماں کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تو وہ آواز دے کر اُسے کھانے کے لئے بلا لیتی۔ مار بھی وہ سب سے زیادہ ماں سے کھاتا تھا اور چپک کر سوتا بھی اُسی کی ساتھ تھا۔ گرمیوں کے دنوں میں چھت پر بستر لگ جاتے اور سونے سے پہلے تینوں بھائی خوب باتیں کرتے، مستی کرتے اور جب وہ رسوئی کا سارا کام سمیٹ کر سونے کے لیے آتی تو وہ بھائیوں کو چھوڑ کر جھٹ سے ماں کے بستر پر آ جاتا۔ وہ سارے دن کی تھکی ہاری سونے کو بے چین اور یہ کھلے آسمان پر چمکتے تاروں اور چاند کی گردش نہارتا اور سوالوں کی بوچھار کر دیتا۔ ایک دو جواب دے دیتی پھر ڈانٹ کر اُسے باپو کے پاس چلے جانے کو کہہ دیتی تو اس کے بعد وہ اُس سے کوئی سوال نہ کرتا۔ بادلوں کے ٹکڑوں سے بنتی مختلف شکلوں کو دیکھ کر اُس سے رہا نہ جاتا۔ پھر وہ بھائیوں کے پیچھے پڑ جاتا۔

''ویر وہ دیکھو وہ شیر لگ رہا ہے نہ؟''

''اوئے وہ دیکھو شیر کے ساتھ وہ کون ہے؟ وہ تو جیتی کی دادی اور وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟''

پھر تینوں بھائی مل کر اُن شکلوں کو دیکھتے، بحث کرتے اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ہربنس جب ایک زوردار جھڑک دیتا تو سب چپ چاپ لیٹ جاتے اور ہلکی ہلکی کھُسر پھُسر کی آوازیں آتی رہتیں۔ ماں تینوں کو اس طرح ہنستا دیکھ کر بہت خوش ہوتی دن

بھر کی تھکان غائب ہو جاتی اور جب ہربنس انہیں چپ چاپ سونے کے لیے پھر ڈانٹنے لگتا تو وہ دھیرے سے کہتی۔

''کر لینے دو مستی بچوں کو یہ ہی عمر ہے۔''

اور وہ چپ چاپ تکیہ گردن کے نیچے سے نکالتا اور سر کے اوپر رکھ کر سو جاتا۔

گُرمیت نے گھر کی، بچوں کی اور زمینوں کی ذمہ داری سب اپنے کندھوں پر لے رکھی تھی۔

بچوں کی پڑھائی کی ذمہ داری ہربنس پر ہی تھی۔ صبح سویرے وہ بھی تیار ہو کر دفتر کے لئے نکل جاتا۔ اس کا دفتر شہر میں گاؤں سے تقریباً چالیس کلومیٹر دور تھا۔ شام کو وہ تھکا ہارا جب گھر لوٹتا تو گُرمیت اُسے چھوٹی چھوٹی باتوں سے کبھی پریشان نہیں کرتی تھی۔ ہربنس بھی کوئی کام بیوی کی صلاح کے بنا نہیں کرتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ خود سے زیادہ اسے بیوی کے فیصلوں پر اعتماد تھا۔ اگر پتی بیوی کی عزت کرتا ہو تو بچے خود بخود ماں کی عزت کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ گھر کا مرکزی کردار تھی اور گھر کی کائنات اُس کے ارد گرد گھومتی تھی۔ باپ سے زیادہ بچے ماں سے ڈرتے تھے۔ مگر جوگی پر تو کسی کا رعب نہیں چلتا تھا۔ وہ ماں کے غصے سے نہیں بلکہ اس کی ناراضگی سے ڈرتا تھا۔

جب کبھی بھی کوئی گاؤں میں یا اُن کے محلے میں شرارت ہوتی تو سب کے ذہن میں جوگی کا نام اُبھرتا۔ بچپن میں شرارتیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ گرمیوں کی دوپہر جب تیز لُو سے بچنے کے لیے لوگ گھروں میں آرام فرما رہے ہوتے تو موقع دیکھ کر وہ لوگوں کے دلان میں پڑے آم کے آچار کے مرتبان اُٹھا کر کسی اور جگہ پر رکھ دیتے یا اُن کے پاس وہ فہرست تیار ہوتی کہ کس کے گھر آم، امرود، لوکاٹ، انگور لگے ہوئے ہیں اور جب پھلوں کا موسم پورے شباب پر ہوتا تو موقع ملتے ہی اُسے اڑا جاتے۔ صبح تک درخت بالکل بیوہ کی سونی مانگ کی طرح سسک رہا ہوتا۔ سردیوں کی رات جب لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک کر رضائیوں میں گھُسے ہوتے تو یہ لڑکے چپ چاپ جا کر دروازہ کھٹکھٹا آتے اور جب وہ

رضائی سے نکل کر ٹھٹھرتا ہوا دروازہ کھولنے آتا تو وہاں کوئی بھی نہ ہوتا اور دوسری بار بھی جب یہ سب دوہرایا جاتا تو اندھیرے میں چھپے بچوں کو خوب گالیاں سننی پڑتیں۔ کئی بار تو ایسے بھی ہوتا کہ دُکانداروں کے بورڈ راتوں رات بدل دیے جاتے۔ لوگ صبح اُٹھتے تو موچی کی دکان کے باہر ڈاکٹر کا بورڈ، نائی کی دکان کے باہر کپڑے والے کا بورڈ اور اسی طرح سب اُلٹ پلٹ ہو جاتا۔ ان سب شرارتوں کے پیچھے ایک ہی دماغ چلتا تھا اور وہ تھا جوگی کا۔ بڑی آسانی سے وہ بچوں کو اپنے پیچھے لگا لیتا تھا۔ لوگ شکایتیں کر کے تھک چکے تھے اور گُرمیت سُن سُن کر عاجز آ چکی تھی۔

یہ بھی سچ ہے کہ شرارتی بچہ خود اپنا ہی سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔ شرارت شرارت میں دوستوں سے شرط لگا لی اور بنا سوچے سمجھے اسکول کی دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی۔ شرط تو جیت گیا مگر سر پر آٹھ ٹانکے لگانے پڑے۔

گرمیوں کی ایک دوپہر چند دوستوں کے ساتھ گھومتے گھومتے دریا میں نہانے پہنچ گئے۔ ابھی وہ تیرنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ وہاں کھیلتے بچوں کے ایک دوسرے ٹولے سے زور زور سے ''بچاؤ بچاؤ'' کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک بچہ ڈوب رہا تھا اور مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ آواز سنتے ہی جوگی اُس اور لپکا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ لہروں کے چنگل سے اُسے بچانے دریا میں کود پڑا۔ لہروں سے ٹکراتا، الجھتا وہ اسے بچا لایا۔ اُس وقت اُس کی عمر کوئی چودہ برس کی رہی ہوگی۔ جو بھی سُنتا اس کے حوصلے کی داد دیتا۔ لوگوں نے اُسے ڈھیر ساری دعائیں دیں تو گرمیت کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ عمر بڑھتی گئی تو شرارتوں کی نوعیت بھی بڑھتی گئی۔

کالج پہنچتے پہنچتے اُس کا قد چھ فٹ کا ہو گیا تھا۔ اپنے بڑے بھائیوں سے زیادہ قد نکال لیا تھا۔ ان دونوں کی طرح اُس نے بھی شہر میں داخلہ لے لیا تھا۔ اسکول تو اسکول کالج میں جاتے ہی اُس نے اپنی الگ پہچان بنا لی تھی۔ وہ ایک مست ملنگ، خوش طبیعت، خوش گفتار، چنچل شوخ طبیعت کا مالک، ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنے کو تیار۔ پہلے ہی سال وہ کالج

کے الیکشن میں کود پڑا اور اُن کا نمائندہ چن بھی لیا گیا۔ بہت سی لڑکیاں اُس پر دل و جان سے فدا تھیں پر اُس نے کبھی اُنہیں توجہ ہی نہیں دی۔ ہاں کبھی کبھی وہ جیتی کو ضرور اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھا کر لے جاتا تو لڑکیاں دل ہی دل میں جیتی سے جل کر رہ جاتیں۔ جیتی اُس کے گاؤں کی رہنے والی ایک سیدھی سادی ذہین لڑکی تھی جو جوگی کے ساتھ کھیلتے کودتے ہی جوان ہوئی۔ وہ تو خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اُس کے دل میں بھی جوگی کی لو لگ چکی ہے۔ یہ احساس تو اُسے اس روز ہوا جب وہ ایک شام اُس کے موٹر سائیکل پر سوار کالج سے واپس گھر آ رہی تھی کہ اچانک آسمان پر چھائے بادل ٹوٹ کر برس پڑے۔ مجبوراً اُنہیں ایک گھنے پیڑ کے نیچے سہارا لینا پڑا۔ سر سے پاؤں تک دونوں بھیگ چکے تھے۔ بارش تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بادلوں نے شام سے پہلے ہی شام کر دی تھی۔ بھیگے جسم سے چپکا لباس اور اُوپر سے ڈھلتی شام جیتی کو بے چین کر رہی تھی:

''جوگی چل نکل چلتے ہیں موسم تو ٹھیک ہونے والا نہیں۔ گھر پر ماں بھی فکر کر رہی ہوگی۔''

''بارش تیز ہے راستہ صاف دکھائی نہیں دے رہا۔ کوئی حادثہ ہو گیا تو کیا منہ دکھاؤں گا تیرے گھر والوں کو۔''

''مگر جوگی ابھی تو روشنی ہے نکل جاتے ہیں اگر بارش نہ رکی اور رات ڈھل گئی تو کچھ دکھائی نہ دیگا:''

کچھ پل وہ خاموش سوچتا رہا۔

''کہتی تو تُو ٹھیک ہے۔ چل پھر رب کا نام لے کر چل پڑتے ہیں۔''

دونوں درخت کی چھاؤں سے نکلے اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ کئی جگہ پھسلن کی وجہ سے موٹر سائیکل ڈولنے لگا تو جیتی گرتے گرتے بچی۔

''پکڑ کر بیٹھ جا مجھے۔ کھا نہیں جاؤں گا تجھے۔ بس تجھے صحیح سلامت گھر پہنچا دوں۔''

اور اُس نے گرنے سے بچنے کے لیے جوگی کو کس کر کمر سے پکڑ لیا۔شاید جوانی کی ترنگ، موسم کا خمار یا قربتوں کا لمس نہ جانے وہ کیا تھا کہ دونوں کے دل دھڑک اٹھے۔ بارش برستی رہی اور جسم کے ساتھ ساتھ دل بھی ایک اچھوتے جذبات میں بھیگتے رہے۔ دونوں نے اک دوسرے کی دھڑکنیں محسوس بھی کیں پر اُس وقت اُسے سمجھ نہ پائے۔ جوگی نے اسے صحیح سلامت گھر پہنچا دیا تو جیتی کی ماں اُسے بلاتی رہی مگر یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا کہ

''بے بے راہ دیکھ رہی ہوگی۔'' وہ نہیں چاہتا تھا کہ جیتی اُس کی آنکھوں میں اُمڑتے جذبات پڑھ لے۔

اُس دن کے بعد دونوں ایک ان کہے رشتے میں بندھ گئے تھے۔ وہ رشتہ خاموش محبت کا تھا جس میں انہوں نے لفظوں سے اظہار کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

شاید یہ ہی وہ خاموش رشتہ تھا کہ جوگی کے چلے جانے کے بائیس سال بعد بھی اُس کے دل کے تار آج بھی اس سے جڑے ہوئے تھے۔اس برسات کے بعد وہ کبھی بارش میں نہیں بھیگی تھی۔ جوگی کے لمس کی خوشبو اس کی رگوں میں بس چکی تھی۔ اس نے وہ پل اپنے دل میں ایسے بسائے تھے جیسے سیپ میں موتی۔ آج وہ کسی اور کی بیوی تھی ایک جوان بیٹی کی ماں جسے وہ خوشی خوشی بیاہ کر رخصت کر رہی تھی۔ اُس نے جوگی کے گھر سے کبھی رشتہ ٹوٹنے ہی نہیں دیا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ جوگی کی بے بے کو بہت اصرار کے بعد شادی میں آنے کے لیے راضی کر سکی تھی۔

اُس روز بھی برسات جم کر ہو رہی تھی جب جوگی ضد کر کے کالج کے ٹُور پر سات دن کے لئے جموں جا رہا تھا۔ گُرمیت اسے بھیجنے کو بالکل راضی نہ تھی۔ ہربنس نے اُسے بڑی مشکل سے راضی کیا۔

'دیکھ گُرمیتے بچے جوان ہو گئے ہیں۔ اب تو انہیں اپنے پلو سے تو باندھ کر نہیں رکھ سکتی۔ جانے دے اسے۔''

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں نے انہیں باندھ کر رکھا ہو۔ بچے جوان ہو جائیں تو کیا ماں باپ کو اپنی زبان بند کر لینی چاہیے؟''

''میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا تم بات کو بے وجہ بڑھا رہی ہو۔''

''بات ایسے ہی بڑھتی ہے۔ان کو اپنی من مانی کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ میں نے لاکھ سمجھایا رتن کو کہ اپنے ملک میں کیا نہیں اپنے گھر میں بھی سب کچھ ہے پھر ودیش جانے کی کیا ضرورت؟ سنی اُس نے ہماری؟ اپنی مرضی کے مالک ہیں ماں باپ کو مجبور کر دیتے ہیں بات منوانے کے لئے۔ یہ نیا چلن چال پڑا ہے زمینیں بیچتے جاؤ اور ودیشوں میں بستے جاؤ چاہے وہاں جا کر گھٹیا سے گھٹیا کام ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ بے شک عزت نہ ملے پر رہیں گے وہیں۔ پیچھے سے بوڑھے ماں باپ چاہے جیئیں یا مریں''۔ یہ کہہ کر وہ زار زار رونے لگی۔

''دیکھ گرمیتے تو کہاں کی بات کہاں لے گئی۔ رتن کا غصہ اب جوگی پر اتارے گی چل چپ کر۔ ایسے نہیں روتے۔''

جوگی باہر کھڑا سب باتیں سُن رہا تھا۔ اُسے تو یہ امید تھی کہ باپو منا لے گا بے بے کو مگر ماں کو اس طرح روتا دیکھ وہ اندر آ گیا۔

''بے بے رو کیوں رہی ہے میں کہیں نہیں جا رہا۔ جموں تو بہت دور کی بات ہے تو کہے گی تو میں رب کے پاس بھی نہ جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ ماں کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''تو بھی اُنہیں کا بھائی ہے ایک دن تو بھی چلا جائے گا گاؤں چھوڑ کر۔ پڑھ لکھ کر کون رہنا چاہتا ہے یہاں۔''

''بے بے وعدہ ہے میرا تجھ سے میں گاؤں میں ہی رہوں گا۔ سیاست کرنی ہے مجھے اور اپنی زمینوں اپنے گاؤں کو بہت آگے لے کر جانا ہے۔ تجھے بھروسا ہے نا اپنے بیٹے پر۔''

''ہٹ پیچھے۔ جا چلا جا اپنے دوستوں کے ساتھ''۔

گُرمیتے نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''دل سے کہہ رہی ہے نا بے بے؟''

''ہاں ہاں دل سے کہہ رہی ہوں۔ بس اپنا خیال رکھنا۔''

''تو فکر نہ کر بے بے ایک ہفتے کی تو بات ہے۔''

گرمیت کو کیا پتا تھا کہ ایک ہفتے کا انتظار صدیوں میں بدل جائے گا۔ اور پھر بارش تو اُس دن بھی ہو رہی تھی جب جوگی کے جانے کے چار روز بعد ہی یہ خبر آئی تھی کہ وہ لاپتا ہوگیا ہے۔ ہوا یوں کہ دوستوں کے ساتھ دریا میں نہانے چلا گیا۔ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ اُنھوں نے تیرنے کا پروگرام رد کر دیا مگر کسی لڑکے نے چنوتی دی تو شرط لگ گئی اور وہ شرط پوری کرنے دریا میں کود پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی اُسے بہا کر نہ جانے کہاں لے گیا۔ خبر ملتے ہی ہربنس چند رشتے داروں کے ساتھ جموں کے لئے روانہ ہوگئے۔ گرمیت بس ہربنس اور جوگی کے لوٹنے کی دعائیں کرتی رہی۔ اپنے آپ کو بار بار تسلی دے رہی تھی کہ ''رب سب ٹھیک کرے گا۔ وہ اتنا بے رحم نہیں ہوسکتا۔''

نہ کچھ ٹھیک ہونا تھا نہ ہوا۔ جموں پولیس نے لڑکوں کے بیان لئے اور غوطہ خوروں نے جال پھینک کر بھی تلاش شروع کر دی مگر اُس کا کہیں کوئی سراغ نہ ملا۔ تین روز بعد ہی وہ خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح جو اپنی زندگی کی پونجی گوا کر گھر واپس لوٹتا ہے۔ یہ خبر آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی اور لوگ جوگی کی بے وقت جوان موت کا افسوس کرنے گرمیت کے پاس جا پہنچے مگر وہ لوگوں پر اُلٹے برس پڑی۔

''یہاں کوئی تماشا لگا ہے جو دیکھنے آئے ہو۔ میرا بیٹا مرا نہیں لاپتا ہوا ہے۔ اگر لاش مل جاتی تو افسوس کرنے آتے۔ زندہ لوگوں کا ماتم نہیں کرتے۔ اگر تم میرے اپنے ہو تو بس دعا کرو کہ وہ جدھر بھی ہو صحیح سلامت ہو۔ دیکھ لینا ایک دن وہ لوٹ کر آئے گا یہاں میرے پاس اپنے گاؤں میں۔ وعدہ کیا ہے اُس نے مجھ سے اور وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اب جاؤ سب اپنے اپنے گھروں کو''۔ اُس نے اتنا کہا اور ہاتھ جوڑ دیئے۔ پھر گھر کا دروازہ بند کیا اور صحن میں آ کر رسی پر نڈھال گر پڑی۔

لوگ سمجھ رہے تھے کہ شاید صدمے کی وجہ سے ماں کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے وہ سچ کو قبول نہیں کرنا چاہتی۔ اُس روز بارش نے جیتی کے آنسو ضبط کر کے اُسے رسوا ہونے سے بچا لیا تھا۔ گرمیت کا یقین اتنا پختہ تھا کہ کوئی اسے ڈگمگا نہ سکا۔ جوگی کے لئے وہ تڑپتی تھی

اُسے یاد کرتی تھی پر آنکھ سے کبھی آنسو چھلکنے نہیں دیئے۔ ہربنس جانتا تھا کہ اُس کی بیوی بہت مضبوط ہے پر وہ اُس سے زیادہ کمزور ہوگا یہ اُسے اب معلوم ہوا تھا۔ وقت گزرتا گیا اور گزرتے وقت کے ساتھ سب نے سمجھوتہ کر لیا کہ جوگی اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا مگر بے بے کا انتظار برقرار رہا۔ اُسے یقین تھا کہ اک روز دروازے پر بنا دستک دیئے اک دم سے اُس کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔

دُنیا کے کاروبار بدستور چلتے رہے۔ گھر میں دونوں بیٹوں کی شادی رچائی گئی۔ بہوویں گھر میں آئیں اُس کے گھر میں رونق تھی پر دل کا خالی کونہ روتا رہا سسکتا رہا پر آنکھ سے ایک قطرہ بھی گرنے نہ دیا۔ ضبط کا پیمانہ تو اُس روز چھلکا جب ایک دن جیتی اُس کے پیروں میں پڑ کر گڑگڑانے لگی:

''آپ سے ایک بات کرنی ہے چاچی۔''

''بول بیٹی کیا بات کرنی ہے تجھے؟''

''میرے ماں باپ میری شادی طے کر کے آئے ہیں پر میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''کیوں؟''

وہ خاموش رہی۔

''لڑکا پسند نہیں کیا''؟

''تو مجھے اپنے گھر میں رکھ لے چاچی۔ میں تیرے گھر کا سارا کام کروں گی تیرا خیال رکھوں گی پر مجھے پرایا نہ کر۔'' اس نے بڑھ کر جیتی کو سینے سے لگا لیا۔

''جوگی آ جاتا تو میں تجھے اس گھر کی رونق بنا لیتی۔ پتا نہیں وہ کب لوٹ کر آئے گا۔ تو بھلا اس کے لیے کیوں اپنی زندگی برباد کرتی ہے جس نے کبھی تجھ سے کوئی وعدہ بھی نہیں کیا۔ جا بیٹی اپنے ماں باپ کا بوجھ ہلکا کر۔'' اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔ اُس روز وہ بہت روئی تھی۔ اُس نے دل اور آنکھوں پر کوئی روک نہیں لگائی۔

گزرتے وقت کے ساتھ نئے پھول پودے کھلے تو پرانے پتے جھڑنے لگے۔
ہربنس اتنی جلدی دُنیا چھوڑ کر جانے والا تو نہ تھا اُسے تو بس بیٹے کی جُدائی اور بیوی کا اندر ہی اندر سلگنا لے ڈوبا اور وہ گرمیت کو ویر کے حوالے چھوڑ کر چل بسا۔ اُس نے تو ہربنس کے آخری وقت اُس کے سرہانے بیٹھے شکایت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ بیچ سفر میں اکیلے چھوڑ کر جا رہے ہو''۔ وہ سب سُن رہا تھا پر جواب دینے کی قوت اُس میں نہ تھی۔ آنکھوں سے ہی کچھ بیاں کیا۔ جو وہ سمجھ گئی۔

''میں تو ابھی جانے والی نہیں۔ معاف کرنا اس وقت تمہارا ساتھ بھی نہیں دے سکتی۔ ہو سکے تو رب کو یہ سفارش ضرور کرنا کہ جوگی سے ملے بنا مجھے بلائے نہ۔''

اور وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ ایک عورت کے کتنے روپ ہوتے ہیں پر ماں کا روپ سب سے الگ سب سے پیارا۔ ماں کے کردار کے آگے بیوی کا کردار بھی ہار جاتا ہے۔

سردیوں کی ایک دوپہر وہ صحن میں بیٹھی ویر کے بچوں کے لئے سویٹر بُن رہی تھی کہ اس کا بڑا پوتا بھاگتا ہوا سیدھے اُسی کے پاس آیا۔

''بے بے کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔''

''کون ہے؟'' اس نے عینک ٹھیک سے لگاتے ہوئے دیکھا۔

دروازے پر دو اجنبی کھڑے تھے۔

''اندر آجاؤ۔ کس سے ملنا ہے آپ کو''

''یہ جوگی کا گھر ہے؟''

اتنے سالوں کے بعد کسی اجنبی سے جوگی کا نام سن کر وہ چونک اُٹھی۔

''آپ کون ہیں اور جوگی کو کیسے جانتے ہو؟''

''جی ہم دلی سے آئے ہیں۔ آپ سے کچھ ضروری جانکاری حاصل کرنی ہے۔''

اس نے بہو کو آواز لگائی اور اُسے چائے لانے کو کہا اور اُن سے باتیں کرنے لگی۔

''آپ جوگی کی ماں ہیں شاید؟''

''شاید نہیں میں ہی اُس کی بے بے ہوں۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے''۔

''گھر میں کون کون ہیں؟''

''اس وقت تو میں اور میری بہو ہیں۔ میرا منجھلا بیٹا کام کے سلسلے میں باہر گیا ہے۔''

''آپ کے شوہر؟''

''وہ اس دنیا میں نہیں رہے''

''سنا ہے آپ کا بیٹا جوگی کئی سالوں سے لاپتا ہے۔ اس کے بارے میں کبھی کسی سے کوئی خبر ملی کہ وہ زندہ ہے یا......''

''دنیا سمجھتی ہے کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہے پر میرا دل یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ وہ دنیا کے کسی کونے میں زندہ ہے۔ ایک دن آئے گا ضرور۔ مگر آپ اُس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو وہ بھی اتنے سالوں بعد؟''

''ہم سرکاری لوگ ہیں منسٹری سے آئے ہیں۔ چند لوگوں کی شناخت کرنی ہے اُن میں سے ایک آپ کا بیٹا بھی۔''

''میرا جوگی مل گیا۔ کہاں ہے وہ؟'' اس کی ویران آنکھیں چمک اُٹھیں۔

''ہم آپ سے جو جانکاری لینا چاہتے ہیں وہ آپ ہمیں دے دیں۔ اس کی چند تصویریں بھی۔''

''آپ نے جو پوچھنا ہے پوچھئے۔''

پھر جو جو وہ پوچھتے گئے وہ بتاتی گئی۔ اُس نے جوگی کی بچپن اور جوانی کی تصویریں بھی اُنہیں لا کر دے دیں۔ جاتے وقت وہ اتنا ضرور کہہ گئے کہ ''لگتا ہے آپ کا یقین جیت جائے گا۔ وہ لڑکا شاید آپ کا جوگی ہی ہے جو اس وقت سرحد پار جیل میں ہے۔ بہت جلد آپ کو پوری جانکاری مل جائے گی۔''

''کیا کہا آپ نے کیا وہ پاکستان جیل میں ہے؟''

''وہاں کیسے پہنچ گیا؟''

''دریا پر سرحدیں نہیں ہوتیں۔ پانی اُسے بہا کر دوسری طرف لے گیا اور وہیں سے اس کی بدقسمتی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ لوگ اُسے جاسوس سمجھ بیٹھے۔ کوشش کرتے ہیں اُسے بے گناہ ثابت کرنے کی۔''

''جیندہ رہ پت جیندہ رہ'' خوشی سے اس کی آنکھیں چھلک اُٹھی تھیں۔ اب تک یہ بات آدھے گاؤں میں پھیل چکی تھی کہ جوگی کے گھر سرکاری آدمی آئے ہیں۔

''میں تو ہمیشہ سے ہی کہتی تھی وہ واپس آئے گا ضرور۔ لوگ مجھے پاگل سمجھتے تھے۔ کب تک آجائے گا وہ۔؟''

''شاید دوتین مہینوں میں یا پھر دوتین سالوں میں۔ ہم کوشش تو ضرور کریں گے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

''بیٹا ایک بات کا خیال ضرور کرنا کہ میں زندگی کے اُس موڑ پر کھڑی ہوں کہ پتا نہیں کب بُلاوا آجائے۔ مرنے سے پہلے ایک بار اُسے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''ہم پوری کوشش کریں گے باقی تو جو اوپروالے کو منظور۔''

اتنا کہہ کر وہ تو وہاں سے چلے گئے مگر گُرمیت کا انتظار بڑھ گیا۔ اب وہ سرحد سے آنے والی ہر خبر دھیان سے سنتی تھی۔ اُسے نہیں معلوم کہ وہ سرحد پار کس شہر میں، کس جیل میں ہے۔ اس سے کیسے ملے گی، کب ملے گی بس ہر روز صبح شام وہ اپنے رب سے یہی دعا کرتی ہے کہ ''ربّا اتنی مہلت دے دینا کہ میں اُس سے مل سکوں۔ اک بار اُسے دیکھ لوں اسے سینے سے لگا لوں۔ پھر چاہے لے جانا''

اس خبر کو ملے بھی تین سال گزر چکے ہیں۔ گاؤں کے کچھ لوگ ویرا اور جیتی کے شوہر کے ساتھ مل کر جوگی کا پتا لگانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اب بے بے کو معلوم ہے کہ اس کا جوگی لاہور میں ہے۔ ویرا، جیتی اور اُس کا شوہر لاڈو کی شادی کے بعد اسے لاہور لے کر جائیں گے۔ گُرمیت شادی کی رسوم پوری ہونے کا شدت سے انتظار کررہی ہے۔

☆☆

لفٹ

ابھی گھر سے دفتر کے لئے وہ گاڑی میں نکلا ہی تھا کہ چھم چھم بارش شروع ہوگئی۔ کالے گھنے بادلوں کے چھا جانے سے دن میں بھی شام کا گماں ہونے لگا۔ اس کے گھر سے دفتر کا راستہ کوئی پندرہ کلومیٹر کا تھا۔ ابھی کوئی دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ بس سٹاپ پر چھاتا لئے ہوئے دو عورتیں کھڑی تھیں۔ گاڑی کو آتا دیکھ انہوں نے لفٹ کے لئے ہاتھ دیا اور اُس نے گاڑی روک دی۔ انہوں نے اُس کے دفتر کے راستے میں ہی جانا تھا۔ موسم کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اُس نے انہیں گاڑی میں بٹھا لیا۔ جب وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے لگیں تو اُس نے کہا

''دیکھئے میں ڈرائیور نہیں ہوں، ایک اگلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ''

اُس میں سے ایک پیچھے بیٹھ گئی اور ایک اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ راستے میں موسم اور شہر میں بڑھتے ٹریفک کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ ہی دیر میں ان کا مقام آگیا اور وہ دونوں شکریہ ادا کر کے اُتر گئیں۔ باتوں باتوں میں راستہ کیسے کٹ گیا اُسے پتہ ہی نہ چلا۔

اُسے اکیلے سفر کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔ جب کبھی بھی کسی نے لفٹ مانگی خاص طور سے کسی لڑکی نے تو اُس نے جھٹ سے اُسے بٹھا لیا۔ اگر ساتھ والی سیٹ پر کوئی لڑکی بیٹھ جاتی تو باتوں کا سلسلہ چلتا ہی رہتا اور وہ دائیں طرف کا موڑ اس انداز سے کاٹتا کہ وہ خود کو

سنبھال بھی نہ پاتی اور اس پر گر پڑتی اور وہ محض اُس کے لمس سے ہی خوش ہو جاتا۔اس سے آگے بڑھنے کی اُس نے کبھی ہمت ہی نہیں کی تھی ۔ ہر عزت دار آدمی کی طرح بدنامی سے ڈرتا تھا۔

بچپن سے ہی وہ رنگین مزاج تھا۔لڑکپن کب کا گزر چکا۔شادی ہوئی دو بچے بھی ہوئے جو تیزی سے جوانی کی طرف قدم بڑھا رہے تھے مگر خود اُس کا لڑکپن ابھی تک گیا نہیں تھا۔اُس کی بیوی کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ وہ دوسری عورتوں کو دیکھنے سے باز نہیں آتا۔جب کبھی وہ اُس کے ساتھ بھی ہوتی تو اُس کی گردن عورتوں کو دیکھتے ہی خود بخود گھوم جاتی اور وہ غصے سے چلاّ پڑتی ''شرم نہیں آتی ۔دوسری عورتوں کو اس طرح گھورتے ہوئے''

''کمال ہے اس میں شرم کی کیا بات ہے۔بھگوان نے خوبصورت چیزیں دیکھنے کے لئے ہی تو بنائی ہیں'' وہ بے شرمی سے ہنس کر کہتا۔

''اور اگر کوئی تمہاری بیوی کو اِس طرح دیکھے؟''

''دیکھنے دو۔دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ہاں اگر کوئی ہاتھ لگائے تو برداشت نہیں کروں گا''

وہ دل ہی دل میں جل کر رہ جاتی اور سوچتی کہ اس آدمی سے بات کرنا فضول ہے۔

شام کو جب وہ گھر سے دفتر کے لئے نکلا تو آسمان صاف ہو چکا تھا۔سڑک پر پھر سے گہما گہمی شروع ہو چکی تھی۔اُس نے اُسی جگہ پھر سے انہیں دو عورتوں کو سڑک کے دوسری طرف بس کا انتظار کرتے دیکھا تو اُس کی گاڑی کی بریک خود بخود لگ گئی۔نظریں ملتے ہی وہ مسکرا دیں اور خوشی خوشی ایک اگلی سیٹ اور دوسری پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔موسم کا خلاصہ ہوتا رہا۔گاڑی میں لگے پرانے گانوں پر باتیں ہوتی رہیں گاڑی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ عادت سے مجبور اُس کے من کا شیطان پھر سے اُسے چیونٹیاں کاٹنے لگا۔منزل نزدیک آتے دیکھ کر اُس نے تھوڑی سی ہمت جٹائی۔اُس نے گیئر اس طرح بدلا کہ اُس کا ہاتھ اُسکی ٹانگوں کو چھوتا ہوا آگے بڑھ گیا۔دوسری طرف سے کوئی ردعمل نہ دیکھ کر اُس کا حوصلہ اور بڑھ

گیا۔اُس نے پھر سے بے وجہ گیئر بدلا اور پھر اُسے چھولیا۔اس بار اس عورت نے مڑ کر اُس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''یہ بہانے بہانے سے کیا چھو رہے ہو۔بتاؤ کدھر چلنا ہے''؟

اس طرح کے بے باک جواب کے لئے وہ بالکل تیار نہ تھا۔شرمندگی اور جھینپ کو مٹانے کے لئے وہ جھٹ سے بولا۔

''بہانے سے چھونے کا کیا مطلب ۔ یہ تو گیئر بدلتے بے ارادہ ہاتھ لگ گیا''

اس کے ساتھ ہی اُس نے گاڑی روک دی اور انہیں اُترنے کے لئے کہا۔

''میں سب جانتی ہوں۔ارادے اور بےارادے کو،اب پسینے کیوں چھوٹ رہے ہیں چل کدھر چلنا ہے؟'' وہ بے شرمی سے بولی۔تم سے وہ تو پر اُتر آئی۔

''مجھے کہیں نہیں جانا۔تم لوگ اُترو جلدی سے'' وہ اونچی آواز میں بولا۔وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ عورتیں صرف شرافت کا نقاب اوڑھے ہوئے ہیں۔

''غصہ کیوں کر رہا ہے۔نہیں مرضی جانے کی تو جانے دے،چل کہیں چل کر بئیر پیتے ہیں'' اُس عورت نے اُسے کہنی ماری۔

''میں بئیر ویئر نہیں پیتا۔تم بس اُترو جلدی سے۔'' وہ گھبرانے لگا تھا،کہیں کسی نے انہیں ان عورتوں کے ساتھ دیکھ لیا تو؟ یہ سوچ کر ہی وہ بے چین ہو اُٹھا۔مگر وہ اُترنے کے موڈ میں نہیں تھی۔اُس کی حالت دیکھ کر مزے لے رہی تھیں۔

''چل اچھا بئیر بھی نہیں پلاتی تو پانچ سو روپے دے دے''۔

''کیوں؟ میں کیوں دوں پیسے،تم اُترو جلدی''۔

''اُدھار ہی دے دے''۔

''میں تمہیں جانتا ہی نہیں پھر اُدھار کیسے دوں''۔

''بنا جان پہچان کے لفٹ دے سکتا ہے،اُدھار نہیں''۔

''تم اُترتی ہو کہ نہیں''؟

''نہیں...... پیسے لئے بنا ہم اُترنے والی نہیں۔ دیتا ہے پیسے یا شور مچاؤں''؟

دونوں مسکرا رہی تھیں۔

اُن کی دھمکی سے وہ گھبرا گیا۔ اُسے معلوم تھا اب وہ بری طرح پھنس چکا ہے۔ مجبوراً اُس نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور اُس کی اور بڑھا دیا۔ نوٹ پکڑتے وہ مسکرائی۔

''یہ بے ارادہ چھونے کی فیس ہے'' یہ کہتے ہوئے وہ گاڑی سے نکل گئی۔

پیچھے والی نے اُترتے ہوئے پوچھا۔

''کل کتنے بجے لفٹ دے گا، ہم وہیں انتظار کریں گے۔'' دونوں ایک ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

ان کی باتوں کو ان سنی کرتا ہوا وہ گاڑی کو تیز بھگاتا ہوا نکل گیا۔

☆☆

مشرقی لڑکی

جس روز سے وہ خط انہیں ملا تھا ان کی خوشیوں کو شک کا گرہن لگ گیا تھا۔ شادی کی تیاریاں زوروں سے چل رہی تھیں۔ کارڈ چھپ کر تیار ہو گئے تھے اور یہ خط بم کی طرح پھٹا تھا۔ اس بے نام خط کو محض کسی کی شرارت سمجھ کر نظر انداز بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خط ارجن کے نام تھا جس کی تحریر اس طرح تھی۔

ارجن صاحب،

آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ آپ کی اور رشمی کی سگائی کی خبر ملی تو آپ پر ترس آ گیا۔ بہت غور و فکر کے بعد میں نے یہ اپنا فرض سمجھا کہ آپ کو آگاہ کر دوں کہ جس لڑکی کو آپ اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتے ہیں وہ پہلے بھی کئی لڑکوں کے دلوں سے کھیل چکی ہے۔ اس کی خوبصورتی اور سادگی کے کئی لڑکے شکار ہو چکے ہیں۔ میں نے تو یہ تک سنا ہے کہ وہ وکرم نام کے لڑکے کے ساتھ مندر میں چوری چھپے شادی بھی کر چکی ہے۔ جس سے وہ اب بھی آپ سے سگائی ہونے کے بعد بھی ملتی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آس پاس کے لوگوں سے پوچھئے یا خود اسی سے پوچھ لیجئے۔ میں نے تو ایک شریف انسان کو بچانے کے لئے یہ خط لکھا ہے۔ یقین آئے تو ٹھیک نہ آئے تو آپ کی قسمت۔ زندگی آپ کی ہے فیصلہ بھی آپ کو ہی کرنا ہے۔

آپ کا خیر اندیش'

نیچے کوئی نام نہ تھا۔ خط لکھنے والے کا مقصد تو صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ شادی تڑوانا چاہتا ہے مگر اس بات میں کتنی سچائی اور کتنا جھوٹ ہے یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا۔ اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ رشمی بدکار ہو سکتی ہے۔ اتنی سادہ اور معصوم لڑکی دھوکے باز نہیں ہو سکتی۔

پہلی بار اس نے رشمی کو اپنے دوست کی بہن کی شادی میں دیکھا تھا۔ دلہن کی خاص سہیلی۔ گہرے آسمانی رنگ کے سلک کی شلوار قمیض اور ریشمی دوپٹہ۔ کانوں میں جھولتے جھمکے، ماتھے پر چھوٹی سی بندیا، کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں اور کمر تک جھولتی چوٹی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اسے دل دے بیٹھا۔ اسے ایسی لڑکی کی ہی تلاش تھی جو خالص ہندوستانی ہو سادگی اور خوبصورتی کا سنگم۔ مغربی فیشن کی زد میں آئی لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر وہ اکتا چکا تھا۔ پوری شادی میں وہ اس کی نگاہوں کا مرکز بنی رہی۔ موقعہ ملتے ہی اس نے اسے اپنے موبائل میں قید کر لیا اور اپنے دوست سے اس کا اتا پتا معلوم کر لیا۔ گھر جاتے ہی ماں کے ہاتھ میں پتا تھما دیا۔

''خوش ہو جاؤ۔ تمہارا کام آسان کر دیا ماں۔''

''کوئی مل گئی کیا''؟

''پسند تو آئی ہے۔ آگے آپ تسلی کر لیں۔''

''کیسی ہے؟''

''فوٹو دکھا سکتا ہوں۔''

''بات اتنی آگے بڑھ گئی۔؟''

''بات تو ہوئی ہی نہیں۔ یہ تو شادی کی گہما گہمی کا فائدہ اٹھا لیا میں نے۔'' اس نے موبائل سے ماں کو فوٹو دکھاتے ہوئے کہا:

''دیکھنے میں تو اچھی لگ رہی ہے۔ آگے پتا نہیں۔ تجھے پسند ہے تو ہمیں بھی پسند ہے۔ شکر ہے تجھے بھی کوئی لڑکی پسند آئی۔ کل ہی تیرے پاپا سب معلوم کر لیں گے۔ بس

ایک بار بات بن گئی تو چٹ منگنی پٹ بیاہ''۔

واہی صاحب کا اچھا خاصا کاروبار ہے۔ ان کا خاندان علم کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ ان کا بڑا بیٹا ارجن لندن سے بزنس مینجمنٹ کی ڈگری حاصل کر کے آیا تھا۔ آتے ہی اپنے پاپا کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگا۔ ویسے تو اس کی دوستی بہت سی لڑکیوں سے تھی ان کے ساتھ گھومتا تھا پارٹیوں میں جاتا تھا مگر شادی وہ ایسی لڑکی سے کرنا چاہتا تھا جو پہناوے اور تہذیب سے بھی ہندوستانی ہو۔ کئی اچھے اچھے گھروں سے رشتے آئے مگر اسے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آئی۔ ہار مان کر ماں باپ نے فیصلہ اس پر ہی چھوڑ دیا۔

رشمی کے لئے جب واہی صاحب کے گھر سے رشتہ آیا تو خود کو انہوں نے دنیا کا سب سے خوش نصیب سمجھا۔ انکار کرنے کی کوئی وجہ ہی نہ تھی۔ قسمت کہاں بار بار دستک دیتی ہے۔ تھاپر صاحب بینک میں ملازم تھے اپنی بیٹی کے لئے اتنا اچھا رشتہ پا کر پھولے نہ سمائے۔ بیٹی سے اس کی مرضی جاننا ضروری نہ سمجھا اور بہت ہی سادگی سے یہ رشتہ پکا ہو گیا۔

واہی صاحب نے جب خط پڑھا تو انہیں اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

تھاپر صاحب کے پریوار کے بارے میں انہیں جو معلومات حاصل ہوئی تھی اس میں کوئی ایسی ویسی بات نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کوئی یہ رشتہ تڑوا کر تھاپر صاحب سے دشمنی نکالنا چاہتا ہو پھر بھی بات کی تہہ تک تو پہنچنا ہی چاہیے۔ یہ سوچ کر انہوں نے ایک پرائیویٹ ڈٹیکٹیو کو کام پر لگا دیا کہ دو دن میں انہیں پوری رپورٹ چاہیے۔ شادی کا دن نزدیک آ رہا تھا اور وہ کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔ دو دن بعد وہ آدمی اپنی رپورٹ لے کر پہنچ گیا۔ اس کے مطابق رشمی کا کسی وکرم نام کے لڑکے سے دو تین سال سے چکر چل رہا ہے اور وہ اب بھی اس سے ملتی ہے۔

''اس کا مطلب ہے اس خط کا ایک ایک حرف سچ ہے''۔ ارجن نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' ماں کی آواز میں فکر تھی۔

''کرنا کیا ہے آنکھوں دیکھی مکھی نگلی تو نہیں جا سکتی''۔ واہی صاحب نے کہا۔

''لوگ کیا کہیں گے؟ اتنے تھوڑے دن رہ گئے۔ شادی میں اور آپ سگائی توڑ دیں گے۔''

''لوگوں کی باتوں کی خاطر میں اپنے بیٹے کا مستقبل خراب نہیں کر سکتا۔ تمہارا کیا کہنا ہے ارجن؟''

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ پہناوے کا سوچ سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اگر مغربی سوچ کی ہوتی تو ماں باپ سے بغاوت کر دیتی۔ مشرقی لڑکی ہے چپ چاپ اپنے دل میں اپنی محبت کو دفن کر کے ڈولی میں بیٹھ جائے گی۔ مگر پاپا مجھے ایسی جیون سنگنی نہیں چاہیے جو دل میں کسی اور کو بسا کر زندگی سے سمجھوتہ کر لے اور ساری عمر شادی کو فرض سمجھ کر گزار دے۔ میں یہ شادی نہیں کروں گا۔''

'اس کا فیصلہ سن کر واہی صاحب نے تھاپر صاحب کو فون گھما دیا۔

''تھاپر صاحب مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''کہیے میں کب حاضر ہو جاؤں؟''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں بات فون پر بھی ہو سکتی ہے۔''

''آپ حکم کریں۔''

''حکم نہیں گزارش ہی سمجھئے۔ آپ کو سب سے پہلے اپنی بیٹی کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس کی خوشی کس میں ہے یہ آپ کو پتا ہونا چاہیے۔''

''واہی صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''آپ اپنی بیٹی کی شادی اسی لڑکے سے کروا دیجئے جس سے وہ آج بھی ملتی ہے۔ ہم یہ شادی توڑ رہے ہیں۔''

''مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نے تو سب تیاریاں کر لی ہیں۔''

''یہ تو شکر کرو تھاپر صاحب وقت پر پتا چل گیا ورنہ انرتھ ہو جاتا۔ بچوں کی خوشی میں ہی سب کی خوشی ہے۔''

یہ سنتے ہی رسیور تھاپر صاحب کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے دفتر سے شادی کے لئے جو قرض لیا تھا اس میں سے کتنا پیسا تو وہ خرچ چکے تھے چھوٹے دو بچوں کی ذمہ داریاں بھی سر پر کھڑی تھیں۔ اگر یہ شادی نہ ہوئی تو بدنامی کے ساتھ ساتھ نقصان بھی ہوگا۔ انہوں نے اپنی بیوی سے تفصیل میں بات کی اور اسی کے مشورے پر رشمی کی پسند کو ہاں کہنا پڑا جب کہ وہ اس لڑکے کے رشتے کو ٹھکرا چکے تھے۔

''وکرم کو فون کر دو اور اسے کہو آج ہی مجھ سے ملے۔''

یہ سنتے ہی وہ خوشی سے جھوم اٹھی اور اپنا کمرا بند کر کے اسے فون کرنے لگی۔ ''میں نے کہا تھا نہ شادی کروں گی تو صرف تم سے۔''

''کیوں زخموں پر نمک چھڑک رہی ہو۔ کتنے تھوڑے دن رہ گئے ہیں تمہاری شادی کو۔''

''تم آج ہی پاپا سے ملنے آ جاؤ۔ وہاں میری سگائی ٹوٹ گئی ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''جو کام سیدھی انگلی سے نہ ہو سکا وہ ذرا سی ٹیڑھی کرنے پر ہو گیا۔ تم بس جلدی آ جاؤ۔

ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھل گئی۔

☆☆

حاصل زندگی

چاہتے ہوئے بھی میں وطن اپنی ماں سے ملنے نہ جاسکی۔ عمر کے یہ دس سال میں نے نئی جگہ نئی زندگی کی شروعات اور اسے بنانے سنوارنے میں گزار دیے۔ دس سال کا عرصہ بہت لمبا ہوتا ہے۔ مغربی زندگی جتنی دلکش اور رنگین لگتی ہے پاس سے وہ اتنی ہی دشوار اور تکلیف دہ ہے۔ مغرب کی چکا چوندھ مجھ پر اتنا حاوی ہوگئی کہ ماں کا پیار، اس کی قربانی سب پھیکے پڑ گئے۔

میں اور میرا چھوٹا بھائی سنجو بہت چھوٹے تھے جب پتا جی ایک روز اچانک ہم لوگوں کو بے سہارا چھوڑ گئے۔ بہت دھندلی سی ماں کی وہ شکل یاد ہے جب ان کے ماتھے پر لال گول بندیا، مانگ میں سندور اور چوڑیوں سے بھری کلائیاں سجی رہتی تھیں۔ بھری جوانی میں ماں بیوہ ہوگئی۔ ماتھا، مانگ اور کلائیاں سونی ہوگئیں۔ زندگی بے رنگ ہوگئی۔ رنگ برنگے لباس کی جگہ سفید رنگ نے لے لیا۔ پتا جی کے ساتھ ہی شاید وہ بھی اپنی زندگی ختم کر دیتی اگر ہم دونوں کی زندگی کا سوال نہ ہوتا۔ ہم دونوں ان کے جینے کا بہانہ اور مقصد بن گئے۔ پتا جی کی محدود پنشن اور لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے ہم دونوں کو پال پوس کر بڑا کیا۔ ہماری ضرورتیں پوری کرنے کے لیے وہ دیر رات تک سلائی کی مشین پر بیٹھی رہتی۔ جب تک پتا جی زندہ تھے ساری دنیا اپنی تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ مگر ان کے انتقال کے بعد سب نے آنکھیں پھیر لیں۔ خوشیوں نے ہمارے گھر سے منہ موڑ لیا۔ رشتے دار ملنے

سے کترانے لگے کہ شاید ہم ان سے مالی مدد نہ مانگ لیں۔ لیکن ماں کی خودداری نے کبھی کسی پر اپنی بے بسی اور مجبوری ظاہر نہیں ہونے دی۔ تھوڑے میں گزارا کرنے کی صلاحیت سکھا دی۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ ماں کی مجبوریاں دیکھ کر ہم بچپن میں ہی سیانے ہوگئے۔ ہمارا بچپن شرارت اور بے فکری کی زندگی سے محروم ہوگیا۔ ماں کی محنت اور ہماری کچھ کر دکھانے کی لگن رنگ لائی۔ ہم دونوں بہن بھائی اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے۔ وہ دن ماں کی زندگی کا سب سے خوشی کا دن تھا جس دن سنجو نوکری لگا تھا۔ اس دن اس نے گھر آتے ہی ماں کے ہاتھوں سے کپڑے چھین کر دور پھینک دیے تھے اور لاڈ سے ان کی گود میں سر رکھ کر بہت رویا تھا۔

''بس ماں اب دکھ بھرے دن بیت گئے۔ اب تمہیں مشین چلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب تم صرف آرام کروگی۔ اب تمہارا بیٹا کمائے گا اور تم بیٹھ کر حکم چلانا۔''

''آرام تو میں اس دن کروں گی جب تیری بہن اس گھر سے رخصت ہوگی۔'' ماں نے اس کے بالوں کو پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔

''اس کی فکر مت کرو دولہا تو اس نے پسند کر ہی رکھا ہے اب جلد ہی اسے نکالنے کا انتظام کرتے ہیں۔ بس پھر ہم دونوں ماں بیٹا آرام سے رہیں گے۔'' اس نے اونچی آواز میں مجھے سناتے ہوئے کہا۔

''میں سب سن رہی ہوں تو جو ماں کے ساتھ مل کر کھچڑی پکا رہا ہے۔ اتنی جلدی تیرا پیچھا چھوڑنے والی نہیں۔'' میں نے آکر اس کا کان مروڑ دیا۔

''جائے گی نہیں تو کیا اسے گھر داماد بنائے گی؟''

''کیوں بنے وہ گھر داماد؟ کیا کمی ہے اس میں؟''

''مجھے تو امت بے حد پسند ہے۔ مگر میں تم لوگوں کے یوکے میں بسنے کے ارادے کے خلاف ہوں۔''

'ماں یہ صرف اس کا نہیں ہم دونوں کا خواب ہے۔'

''اپنوں کو چھوڑ کر اتنی دور انجان لوگوں میں زندگی گزارنے کی تم نوجوان پیڑھی سوچ بھی کیسے لیتی ہے؟''

''وہاں مستقبل اچھا ہے۔ رہنے کا اور جینے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ محنت تو ہے پر پیسہ بھی تو خوب ہے۔ پھر آج کے دور میں دوری کیا ہے؟ پیسہ پاس ہو تو کچھ بھی دور نہیں۔''

''محنت یہاں بھی کی جاسکتی ہے، پیسہ یہاں بھی کمایا جاسکتا ہے۔ اگر میرے بچے مجھ سے دور چلے گئے تو میں جیوں گی کیسے؟ میری تو ساری عمر کی کمائی تم دونوں ہی ہو۔'' ماں کی آواز بھر آئی۔

''چھوڑو بیکار کی باتوں کو۔ کتنی خوشی کا دن ہے۔ آج کوئی اداسی کی باتیں نہیں۔''

ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر میں نے پیار سے ماں کا موڈ تو بدل دیا مگر میں جانتی تھی کہ یا تو مجھے اپنا سپنا اور اپنا پیار کھونا ہوگا یا ماں کو دکھ دینا ہوگا۔

آخر کار ماں نے ایک بار پھر میری خوشی کی خاطر اپنے دل کو سمجھا لیا اور خوشی خوشی میری اور امت کی شادی کر دی۔ کچھ ہی مہینے بعد ہم دونوں ماں کو سنجو کے حوالے کر کے نئی دنیا بسانے لندن کے لیے روانہ ہو گئے۔

وہاں ایڈجسٹ ہونا اتنا آسان نہ تھا جتنا ہم سمجھتے تھے۔ جی توڑ محنت کرنی پڑی پھر گورے اور کالے کے بھید بھاؤ نے اندر تک چھلنی کر دیا۔ ایسے میں اپنوں کی یاد ستاتی، ان کی کمی محسوس ہوتی مگر پیچھے مڑ کر جانا بھی آسان نہ تھا۔ دھیرے دھیرے، ہم اس ماحول کے مطابق ڈھل گئے۔ میں اپنی دنیا میں مگن ہو گئی اور سنجو نے بھی اپنی گرہستی بسا لی۔ بہو آ جانے سے ماں خوش تھی۔ اب اسے پوری طرح آرام تھا۔ دھیرے دھیرے ماں نے گھر کی ساری ذمہ داری بہو کو سونپ دی۔ تھوڑے تھوڑے دنوں بعد ماں سے فون پر بات ہو جاتی۔ مگر ماں کو تسلی نہ ہوتی۔ ہر بار وہ ضد کرتی کہ ہم اسے آ کر مل جائیں مگر واپس ہندوستان آنا اتنا آسان تو نہ تھا۔ ایک روز سنجو نے بتایا کہ ماں اسپتال میں ہے تو مجھ سے رہا نہ گیا اور ایک مہینے کی چھٹی لے کر میں اکیلی ہی ماں سے ملنے پہنچ گئی۔ تین سال بعد ماں کو دیکھا تھا۔ کتنی کمزور

لگ رہی تھی۔ چہرہ زرد پڑا تھا مجھے دیکھتے ہی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ دھیرے دھیرے چہرے کی کھوئی ہوئی رنگت لوٹ آئی تھی۔ رما سے میں پہلی بار مل رہی تھی۔ جس طرح وہ ماں کا خیال رکھ رہی تھی دیکھ کر دل کو تسلی ہوئی۔ رما ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی بہو ثابت ہوئی۔ ایک ہفتہ اسپتال رہنے کے بعد ماں کو چھٹی مل گئی۔ میرے واپس آنے تک ماں کافی تندرست ہو گئی تھی۔ میں تو چاہتی تھی کہ میں ماں کو اپنے ساتھ لے جاؤں لیکن ماں ہی اپنے بیٹے کو چھوڑ کر جانے کو راضی نہ تھی۔ سنجو کی گرہستی بڑھ رہی تھی پھر ماں کی بیماری سے گھر کے اخراجات بھی بڑھ رہے تھے۔ میں نے کچھ رقم سنجو کو تھما دی تا کہ اس کی مدد ہو سکے اور ساتھ ہی جلد ہی چکر لگانے کا وعدہ کر کے میں ایک بار پھر ماں سے دور چلی آئی۔ جلد لوٹنے کا وعدہ تو میں پورا نہ کر سکی البتہ ہر مہینے ماں کے اکاؤنٹ میں اس کی دوا کے لیے پیسے بھیجتی رہی۔ خود ماں بنی تو ماں کے پیار اور اس کی قربانی کو بخوبی سمجھنے لگی تھی۔ پریوار بڑھنے سے ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں اور میں چاہتے ہوئے بھی واپس ہندوستان ماں کے پاس نہ جا سکی۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ماں کی صحت بھی ڈھلنے لگی۔ آواز کی کمزوری سنائی دے جاتی۔ پھر جب سنائی کم دینے لگا تو ماں سے فون پر بات بھی بند ہو گئی سنجو نے ہی بتایا تھا کہ ماں کو اب دکھائی بھی کم دیتا ہے۔ میرے کان اب ماں کی آواز سننے کو ترس گئے۔

پچھلے کچھ دنوں سے ماں کو لے کر عجیب و غریب خیال ستا رہے تھے۔ کئی بار نیند سے ڈر کر اس لیے اٹھ بیٹھی کہ ماں کو اکیلے ویرانے میں روتے دیکھا۔ سنجو سے فون پر بات کی تو تسلی نہیں ہوئی۔ ماں کا حال پوچھا تو گول مول جواب دیا۔ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے، مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔ مجھے تعجب تو اس وقت ہوا جب میں نے ہندوستان آنے کی بات کی تو سنجو نے فون ہی کاٹ دیا۔ میں نے بھی اچانک پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔ باپ بیٹی کو چھوڑ کر میں اپنے بھائی اور ماں سے ملنے ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئی۔

میں سمجھتی تھی دس سال بعد میرا چھوٹا بھائی مجھے اپنے سامنے اس طرح اچانک دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھے گا مگر دروازے پر مجھے دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

میرے دل میں جو شک تھا وہ یقین میں بدل گیا جب مجھے ماں کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ میں ماں کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور وہ بات کو گھما پھرا رہا تھا کہ رما نے ہی جواب دیا۔

''ہم تو خود بہت پریشان ہیں۔ آپ کو بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ ماں کا پتہ چل جائے تو ہی آپ کو بتائیں۔''

''ماں کا پتہ چل جائے؟ کیا مطلب ماں لاپتہ ہے؟'' میں نے چیخ کر پوچھا۔

''ہم لوگ کمبھ نہانے الہ آباد جا رہے تھے۔ ماں بھی ضد کرنے لگی اور مجبور ہو کر ہم انہیں ساتھ لے گئے مگر......''

''مگر کیا؟'' میرے صبر کا باندھ ٹوٹ رہا تھا۔

''اتنی بھیڑ میں وہ نہ جانے کہاں کھو گئی۔'' رما نے بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

سنجو چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''ماں کھو گئی، کوئی ناسمجھ بچی تھی جو کھو گئی یا پھر تم انہیں وہاں چھوڑ آئے؟''

'یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ہم ایسا کر سکتے ہیں کیا؟'

''جسے ٹھیک سے سنائی نہیں دیتا، جو ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتا جس کا جسم کمزور ہے اور جو سہارے کے بنا چل بھی نہیں سکتا بھلا اسے اتنی بھیڑ میں لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر تمہارا دل صاف ہوتا تو مجھے اطلاع تو کرتے۔ کمبھ کو گزرے بھی دو مہینے ہو گئے۔''

''آپ کو بتا کر کیا کرتے۔ پولس میں رپورٹ لکھوادی تھی۔''

''رہنے دو سنجو اب صفائی دینے کی کوشش مت کرو۔ ایک ماں تمہارے حوالے کی تھی وہ بھی تم سنبھال کر نہ رکھ سکے۔''

میں نے اسی وقت اپنا سامان اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ سنجو نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''کہاں جا رہی ہو اس وقت؟''

''میں اپنی ماں کے پاس آئی تھی میرا یہاں کوئی نہیں رہتا۔ ماں کے پاس

جا رہی ہوں۔''

''مگر ماں کا پتہ ہی نہیں چل رہا۔ تم کہاں جاؤ گی؟''

''الہ آباد جا رہی ہوں۔ تم جیسے ہزاروں بیٹے اپنی بوڑھی ماؤں کو بوجھ سمجھ کر وہیں اتار جاتے ہیں۔ میرے ہوتے میری ماں بوجھ نہیں ہو سکتی۔ اسے ڈھونڈ کر ہی رہوں گی چاہے مجھے کتنا وقت لگ جائے۔''

''میں بھی ساتھ چلوں گا۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔ تم یہیں رہو۔ ماں کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ ہاں ایک بات یاد رکھنا۔ الہ آباد کا راستہ اپنے بچوں کو ضرور دکھا دینا۔''

یہ کہتے ہوئے میں روتی ہوئی اس گھر سے نکل پڑی۔ پتہ نہیں ماں نے کس طرح یہ صدمہ برداشت کیا ہوگا۔ نہ جانے میری ماں کس حال میں ہوگی۔ ہوگی بھی یا...... یہ سوچتے ہی میں لرز اٹھی۔ میرے قدم خود بخود تیز ہو گئے......

☆☆

بادِ نو بہار چلے

ماسٹر جوگندر سنگھ کی گاؤں میں بڑی عزت تھی۔ گاؤں کے ہر گھر میں تعلیم کا چراغ روشن کرنے میں اُن کا بہت بڑا ہاتھ ہے خاص طور سے لڑکیوں کے معاملے میں۔ انہوں نے لوگوں کو تعلیم کی اہمیت سے روشناس کروایا اور اُن کی باتوں کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ غریب سے غریب کسان بھی اپنی بیٹی کو اسکول بھیجنے لگا۔ بچپن میں اُنہوں نے اپنی ماں کو باپ کا ظلم سہتے دیکھا تھا جس کے گہرے نشان معصوم کے دِل اور دماغ پر گہرا اثر چھوڑ گئے تھے۔ سارا دن ماں گھر کا کام کرتی اور پھر کھیتوں میں پتی کا ہاتھ بٹانے چلی جاتی۔ رات کو جب اُس کا باپو گھر لوٹتا تو شراب کے نشے میں چور چھوٹی سی بات پر ہی ماں پر گالیاں اور تھپڑ برسانے لگتا۔

ماں کو روتے چلاتے دیکھ بچے سہم جاتے اور رونے لگتے۔ معصوم ذہن میں طرح طرح کے سوال اُٹھتے۔ رات کو ماں کے سینے سے چپک کر لیٹ جاتا اور ماں سے سوال کرنے لگتا۔

''ماں تم باپو کی مار کیوں سہتی ہو؟''

''کیا کروں وہ میرا پتی ہے۔''

''تم بھی اس کی پتنی ہو۔ جب وہ تمہیں مارتے ہیں تم بھی ڈنڈا اٹھا کر مارا کرو۔''

''وہ تگڑا ہے میں کمزور ہوں۔ اگر وہ مجھے گھر سے نکال دے تو میں کہاں جاؤں

گی، کیا کروں گی؟ میں تو پڑھی لکھی بھی نہیں۔''

''جب میں بڑا اور تگڑا ہو جاؤں گا تو باپو کو نہیں مارنے دوں گا، اس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔''

''ایسے نہیں کہتے وہ تیرا باپو ہے۔ وہ بُرا نہیں اُس کی شراب پینے کی عادت بُری ہے۔''

بچے کے دل میں جلتی اس بغات کی آگ کو ماں اپنے سینے سے چپکا کر شانت کرنے کی کوشش کرتی۔

جب وہ تھوڑا بڑا ہوا تو اس نے اپنے اردگرد اپنی ماں جیسی کئی عورتیں دیکھ ڈالی اور یہی وجہ تھی کہ وہ گھر گھر تعلیم کا دیا جلانے نکل پڑا۔ گاؤں کی ہر لڑکی کو تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ ہر مصیبت کا مقابلہ کرنا سیکھ لے۔ خود اعتمادی، خودداری اور عزت کے ساتھ زندگی جینے کے لئے علم کا خزانہ پاس ہونا بہت ضروری ہے۔ علم کی روشنی کے ساتھ گاؤں میں ترقی بھی ہوئی۔ لوگوں کے رہن سہن اور سوچ میں بھی بدلاؤ آیا۔ اس سب کے پیچھے ماسٹر جوگندر سنگھ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

ماسٹر جوگندر سنگھ کو زمین کے بٹوارے میں تین کلّا زمین اور دو مویشی ہی حصّے آئے تھے۔ خود پڑھ لکھ کر وہ سرکاری ماسٹر ہو گئے اور کھیتی باڑی اور مویشیوں کا کام اُن کی بیوی ترپت کور کی دیکھ ریکھ میں ہونے لگا۔ سال بھر کا گیہوں، دال، چاول، سبزیاں اُس کے پریوار کے لئے اس زمین سے مہیا ہو جاتے۔ دودھ دہی کی ضرورت گھر کے مویشیوں سے پوری ہو جاتی۔ اُن کی دو بیٹیاں لاڈی اور چنّی اور دو بیٹے سُکھ دیو اور جگدیو گاؤں والوں کے لئے مثال تھے۔ لاڈی ان کی پہلی اولاد تھی اس لئے اُن کی لاڈلی بھی تھی۔ پڑھنے میں ذہین اور گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتی۔ چھوٹے بہن بھائیوں کا پورا خیال رکھتی۔ گاؤں کا کوئی بھی بچہ اُن سے پنگا لینے کو ڈرتا۔ وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی خاطر سب سے لڑنے کو تیار ہو جاتی۔ گاؤں میں اسکول صرف دسویں تک ہی تھا اس لئے لاڈی کو کالج کی

پڑھائی کے لئے شہر کے کالج اور ہوسٹل میں داخلہ دلوا دیا۔ اپنے گاؤں میں وہ پہلی لڑکی تھی جو شہر پڑھنے گئی تھی۔ اُن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اپنی بیٹیوں کو شہر پڑھنے کے لئے بھیجنے کی ہمت جُٹا لی تھی۔ ماسٹر جی کا کہنا تھا۔ ''لڑکیاں کسی طرح بھی لڑکوں سے کم نہیں۔ اُن کو جینے کے لئے برابر کے حق اور موقعے ملنے چاہیئے۔''

اُن کی لگن اور بچوں کی محنت رنگ لائی۔ اُن کے چاروں بچے پڑھ لکھ کر اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہو گئے۔ اچھی نوکریاں تو ملی مگر بچوں کا گاؤں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناتا چھُوٹ گیا۔ شہر میں ہی لاڈی کو اپنے ساتھ کام کرتا پون کمار پسند آ گیا۔ ماسٹر جی نے ذات برادری سے باہر شادی کرنے کے خلاف اُٹھنے والی رشتے داروں اور ترپت کور کی آواز کو اپنے فیصلے کی مُہر لگا کر دبا دیا۔ بچوں کی خوشی میں ہی اُن کی خوشی تھی۔ اس لئے سب کی مخالفت کے باوجود انہوں نے اپنی لاڈی کی شادی اس کی پسند کے لڑکے سے کر دی۔ بے شک لاڈی پرائے گھر جا چکی تھی پھر بھی ماسٹر جی کوئی بھی اہم کام لاڈی کی صلاح کے بنا نہیں کرتے تھے۔ انہیں ذرا سی بھی پریشانی ہوتی تو وہ بنا جھجھک لاڈی سے ملنے چلے جاتے یا فون پر بات کر لیتے۔ لاڈی نے بھی بیٹی کے فرائض بخوبی نبھائے اور بہو کے فرض سے بھی پیچھے نہیں ہٹی۔ حالانکہ اُس کے شوہر کو ماسٹر جی کا لاڈی کو ہر بات میں Involve کرنا بالکل پسند نہ تھا۔ وہ اسے اپنی زندگی میں دخل اندازی سمجھتا تھا۔ جب بھی وہ اس بات کے خلاف منہ کھولتا۔ لاڈی اُسے پیار سے اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے شانت کر دیتی۔ دھیرے دھیرے ماسٹر جی اپنے سبھی بچوں کی شادیاں کر کے اپنے فرض سے فارغ ہو گئے تو لاڈی دو دو بیٹوں کی ماں بن کر گھر گرہستی میں اُلجھ گئی۔

ماسٹر جی نوکری سے تو رٹائر ہو گئے مگر بچوں کو پڑھانے کا سلسلہ جاری رہا۔ دونوں بزرگ بڑے آرام سے زندگی گزارنے لگے۔ بچوں کے دور ہوتے ہوتے بھی اُنہیں کبھی اکیلا پن محسوس نہیں ہوا کیونکہ گاؤں کے لوگ اُن کے ساتھ تھے۔ کوئی نہ کوئی ان کے پاس اپنی پریشانی لے کر چلا ہی رہتا اور ماسٹر جی اپنی سمجھداری اور سوجھ بوجھ سے جلد ہی اس کے

مسئلے کا حل نکال دیتے اور وہ ماسٹر جی کو دعائیں دیتا نہ تھکتا۔ پھر ایک روز اچانک ترپت کور کو دل کا دورہ پڑ گیا اور ڈاکٹری امداد ملنے سے پہلے ہی وہ سورگ سدھار گئی۔ خبر ملتے ہی لاڈی اور جگدیو سب سے پہلے پہنچے۔ وہ دونوں ہی چنڈی گڑھ میں رہتے تھے اور گاؤں وہاں سے تقریباً دو گھنٹے کی دوری پر ہی تھا۔ سُکھدیو کمپنی کی طرف سے کینیڈا جا بسا تھا۔ اپنی بیوی کو بھی وہ ساتھ لے گیا تھا۔ چنّی کا سسرال میلوں دور کلکتہ میں تھا۔ سبھی بچے جب پہنچ گئے ماں کے آخری درشن کر لئے تو انہیں سپردِ آتش کر دیا گیا۔ کریا کی آخری رسم پوری ہونے تک سبھی وہی ٹکے رہے مگر سب نوکری پیشہ تھے اس لئے کب تک چھٹی لے کر بیٹھے رہتے۔ ماسٹر جی زندگی میں کبھی اکیلے نہیں رہے تھے اور اب اس عمر میں انہیں وہاں اکیلے چھورنے کو بچے تیار نہ تھے اور وہ اپنا گاؤں اپنا گھر چھوڑنے کو راضی نہ تھے۔ گاؤں والوں کی مرضی بھی انہیں بھیجنے کی نہ تھی۔ بچوں کو ماسٹر جی کے فیصلے کے آگے جھکنا ہی پڑا اور سبھی اپنے اپنے گھروں کو بے رنگ لفافے کی طرح لوٹ گئے۔

سارا دن تو ماسٹر جی کا لوگوں میں گزر جاتا۔ کھانے پینے کی بھی کوئی دقّت نہ تھی۔ رملا مائی دونوں وقت کا کھانا بنا کر پروس جاتی مگر شام ہوتے ہی جب سبھی اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تو اُن کو گھر کے در و دیوار کاٹنے کو آتے۔ بچوں کی کمی محسوس ہوتی۔ ترپت کور کی خدمت یاد آتی۔ دُکھ سُکھ میں اس نے ہمیشہ اُن کا ساتھ دیا کبھی کسی بات کی شکایت نہیں کی۔ جیسے جیسے اس کی خوبیاں یاد کرتے، اس کی کمی شدّت سے محسوس کرتے۔ دھیرے دھیرے یہ سب اُن کی صحت پر اثر کرنے لگا اور ان کی صحت گرنے لگی۔ لاڈی اور جگدیو اُن کی گرتی صحت کو لے کر کافی پریشان تھے۔ پھر ایک روز گاؤں سے فون آیا کہ ماسٹر جی کئی دنوں سے بیمار چل رہے ہیں اور بے حد کمزور ہو گئے ہیں۔ خبر ملتے ہی جگدیو گاؤں پہنچ گیا اُنہیں دیکھتے ہی اُس نے اعلان کر دیا۔

''میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ اپنا سامان باندھ لیں۔ اب آپ یہاں اکیلے نہیں رہیں گے۔''

''جگد یو تو جو مرضی کہہ لے میں یہ گاؤں، اپنا گھر یہ زمین چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔''

''جانا تو آپ کو پڑے گا باپو جی۔ میں سب سوچ کر آیا ہوں۔ گھر، کھیت، مویشی سب کا انتظام ہو جائے گا اور اگر آپ نہیں مانے تو مجھے زبردستی کرنی پڑے گی۔''

''تو خود بتا میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔ تم سب تو اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہو گے۔ یہاں تو سارا گاؤں ہے میرے ساتھ۔ لوگوں کے پاس بھی وقت ہے ایک آواز لگاؤں تو دس بھاگے آئیں گے۔''

''باپو جی وہاں آپ اپنے بچوں میں رہو گے ہمارے ساتھ ہمارے سامنے۔ سارا دن اگر ہم مصروف رہیں گے تو کیا؟ رات کو لوٹ کر گھر آئیں گے آپ کے پاس۔''

''اس عمر میں تو ایک بوسیدہ پیڑ کو اُکھاڑ کر نئی زمین میں لگائے گا تو وہ مُرجھا جائے گا۔''

''انسان اور پیڑ میں فرق ہے باپو جی۔ آپ کا کوئی بہانہ نہیں چلنے والا۔ آپ کا بخار اُترتے ہی ہم چنڈی گڑھ جا رہے ہیں۔ میں دو دن میں کھیت اور مویشیوں کی دیکھ ریکھ کا انتظام کرتا ہوں۔''

گاؤں چھوٹا تو ماسٹر جی کی بھوک ہی ختم ہو گئی۔ بچوں کی خوشی کی خاطر وہ خود کو نئے ماحول میں ڈھالنے لگے۔ صبح شام گھر کے پاس والے پارک میں چہل قدمی کرنے چلے جاتے اور پھر تھک کر وہیں بینچ پر بیٹھ جاتے۔ اپنے جیسا اگر کوئی نظر آ جاتا تو دعا سلام کر لیتے۔ ایک دو بزرگ تو ایسے تھے جن سے اُن کی اچھی جان پہچان ہو گئی تھی۔ اُن سے مل کر اُنہیں پتا چلا کہ یہ اکیلے پن کی بیماری سے صرف وہی نہیں بلکہ شہر کے عموماً بزرگ پریشان ہیں۔ شہر میں زندگی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ کسی کے پاس دوسرے کے لئے وقت ہی نہیں۔ جب سے ماسٹر جی شہر آئے تھے بچوں کا گاؤں سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ جب بھی وقت ملتا لاڈی انہیں ملنے چلی آتی۔ فون پر تو وہ ان سے روز ہی بات کر لیتی تھی۔

ماسٹر جی کو گاؤں کی شکل دیکھے اب دو سال ہو چکے تھے۔ ان دو سالوں میں ان کی صحت اتنی گر گئی تھی کہ اب وہ گھر سے باہر اکیلے قدم نہیں رکھتے تھے۔ اب اُن کی سیر صرف گھر کے لان تک ہی محدود رہ گئی تھی۔ اس بار گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے ہی ایک دن ماسٹر جی نے بیٹے کو بُلا کر کہہ دیا ''چھٹیوں میں بچے اور بہو کو لے کر میں گاؤں چلا جاؤں گا۔ تم بیچ بیچ میں آتے رہنا۔''

''ٹھیک ہے باپو جی'' بیٹے نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

بہو نے سُنا تو پتی کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''کیا ساری عمر گاؤں سے باہر بھی نکلیں گے کہ نہیں؟ اس بار تو ہم چھٹیوں میں یورپ ٹور پر جائیں گے۔ کئی سالوں سے ہمیں اسی طرح بہلا رہے ہو۔ کان کھول کر سن لو۔ ہم گاؤں داؤں نہیں جانے والے۔''

''مگر باپو جی؟ دو سالوں سے اُنہیں ہم ٹالتے آ رہے ہیں۔''

''باپو جی کو میں سنبھال لوں گی۔''

''مگر باپو جی کا کیا انتظام کرنا ہے؟ میرا دل نہیں مانتا اُنہیں اس حالت میں چھوڑ کر جانے کا۔''

اُس کی آواز میں مایوسی تھی۔

''ایک مہینے کی تو بات ہے۔ لاڈی دیدی کے پاس رہ لیں گے۔ باپو جی بھی خوش اور لاڈی دیدی بھی۔''

چھٹیاں آئیں تو بہو نے ایسا چکّر چلایا کہ ماسٹر جی کے پاس لاڈی کے گھر رہنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ لاڈی بھی خوشی خوشی اُنہیں اپنے گھر لے آئی۔ اُن کے لئے الگ کمرہ اور ایک الگ نوکر اُس نے انتظام کر دیا مگر اُسے کیا پتا تھا کہ باپو جی کو لا کر وہ اپنی شادی شُدہ زندگی داؤں پر لگا دے گی۔ پون کمار نے جب بیمار ماسٹر جی کو گھر پر دیکھا تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی پھر بھی صبر کا گھونٹ پی گیا۔ رسمی طور پر بات چیت کر لیتا۔

ماسٹر جی کو معلوم تھا کہ وہ انہیں دیکھ کر کچھ خاص خوش نہیں ہوتا تھا مگر یہ سب تو ان کی مجبوری تھی۔ سات آٹھ دنوں بعد ہی میاں بیوی میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ تہذیب کا بناوٹی رنگ جو پون کمار نے اپنے چہرے پر لگا رکھا تھا وہ اب اُترنے لگا کیوں کہ ماسٹر جی کی موجودگی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ لاڈی کا اپنے باپو جی کا اس طرح خیال رکھنا وہ ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔ اب اُس نے ماسٹر جی سے رسمی گفتگو بھی بند کر دی۔ ان کی باتوں کا جواب دینا وہ ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ بات اَن سنی کر جاتا۔ ماسٹر جی ایسے اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ دل ہی دل میں گھُٹ کر رہ جاتے پر لاڈی پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیتے۔ لاڈی سے اپنے شوہر کا باپو جی سے یہ برتاو برداشت کے باہر ہو رہا تھا۔ اس نے پتی کو پیار سے بات کرنے کی التجا کی تو وہ بھڑک اُٹھا پھر کیا تھا بات بڑھتی ہی چلی گئی۔ پتی نے جو زہر اُگلا وہ ان کی شادی شُدہ زندگی کو زہریلا کر گیا۔ ماسٹر جی کو اس ماحول میں گھٹن ہو رہی تھی۔ ایک روز انہوں نے لاڈی کو پیار سے کہا۔

’’لاڈی گاؤں دیکھے بہت دن ہو گئے۔ تیرا اک بھائی تو میری سُدھ بدھ کھو کر کوسوں دور بیٹھا ہے دوسرا دُنیا کی سیر کو گیا ہے۔ ہے تو تو میری بیٹی پر میں تجھے سب سے بڑا بیٹا سمجھتا ہوں۔ تو میری یہ مُراد پوری کر دے۔ مجھے گاؤں لے چل‘‘۔ اُن کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔

’’باپو جی ہفتے دس دن کی تو بات ہے جگدیو لوٹ آئے گا پھر سب ایک ساتھ گاؤں چلیں گے۔ آپ کو یہاں کوئی پریشانی ہے؟‘‘

’’نا بیٹا مجھے تیرے ہوتے کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ بس گاؤں کی یاد آتی ہے۔‘‘

ایک بار پھر وہ باپو جی کو بچوں کی طرح بہلا کر وہاں سے چلی آئی۔ اُسی شام پون کمار نے دفتر سے آتے ہی بیوی کو صاف لفظوں میں کہہ دیا:

’’اگلے ہفتے بنگلور سے چچا اپنے پریوار کے ساتھ آ رہے ہیں‘‘۔

’’یہ تو بڑی اچھی بات ہے‘‘۔

’’خاک اچھی بات ہے۔ تمہارے باپو جی کو یہاں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟‘‘

’’تو کیا ہوا۔ کیا ایک باپ اپنی بیٹی کے گھر نہیں آ سکتا؟‘‘

’’دو چار دن کی بات ہو تو مان لیتے ہیں، وہ تو یہاں چھاونی ڈال کر بیٹھ گئے ہیں میرے گھر میں۔‘‘

’’میرے گھر میں سے کیا مطلب؟ یہ گھر میرا بھی ہے۔ اگر تمہارے پتا جی آ کر یہاں رہ سکتے ہیں تو میرے کیوں نہیں؟‘‘

’’ہمارے یہاں بیٹی کے گھر کا پانی بھی پینا حرام سمجھتے ہیں اور تمہارا باپ......؟ نا جانے کیسے بے شرم خاندان سے میں نے رشتہ جوڑ لیا۔‘‘

’’تم تمیز کی سبھی حدیں پار کر رہے ہو ایسا نہ ہو کہ میں بھی بدتمیزی پر اُتر آؤں بہتر ہوگا اگر تم اپنی زبان کو لگام دے دو۔‘‘

پون کمار غصّے سے آگے بڑھا اور اس کی کلائی پکڑ کر مروڑتے ہوئے بولا۔

’’مجھے تمیز سکھاؤ گی؟ لگام کی ضرورت مجھے ہے یا تمہیں؟ دو دن میں انہیں یہاں سے چلتا کرو۔‘‘ لاڈی نے ایک جھٹکے سے خود کو اُس کی گرفت سے آزاد کیا۔

’’کان کھول کر سُن لو یہ گھر میرا بھی ہے اور میں جب تک چاہوں گی وہ یہیں رہیں گے۔ تمہیں اگر تکلیف ہے تو......‘‘ اس سے پہلے کہ اس کی زبان اور آگ اُگلتی، نوکر گھبرایا ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ ماسٹر جی کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ اُنہیں سانس لینے میں دقّت ہو رہی ہے۔ لاڈی اُسی پل بجلی کی رفتار سے باپو جی کے کمرے میں پہنچ گئی اور پون کمار سر جھٹکا کر گھر سے باہر نکل گیا۔ لاڈی نے جلدی سے باپو جی کی دوائی اُن کے منہ میں ڈالی اور اُن کی پیٹھ پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ان کی طبیعت سنبھل گئی۔ رات بھر وہ ان کے سرہانے بیٹھی رہی۔ صبح جب باپو جی کی آنکھ کھُلی تو لاڈی ان کے پاس کرسی پر بیٹھی بستر پر سر رکھ کر سو رہی تھی۔ اُنہوں نے دھیرے سے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو وہ نیند سے جاگ اُٹھی۔ باپو جی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر بولی۔

’’آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟‘‘

''اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تو رات بھر جاگتی رہی ہے۔ سوئی نہیں دیکھ تو کیا حالت بنا رکھی ہے۔ جا بیٹا تھوڑا آرام کر لے پھر تجھے کام پر بھی جانا ہے۔''

''آرام کی مجھے نہیں آپ کو ضرورت ہے۔''

''پُتر رات مجھے بڑا عجیب سا سپنا آیا۔ تیری بے بے گاؤں والے گھر میں بیٹھی تھی اور کہہ رہی تھی کہ آپ مجھے بھول ہی گئے۔ میں ساری ساری رات اندھیرے میں بیٹھی رہتی ہوں کوئی آ کر بتّی بھی نہیں جلاتا۔ اس کا کیا مطلب ہوا تو سمجھی؟''

''سپنے تو سپنے ہوتے ہیں ان کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ باپو جی۔''

''سپنے بھی بہت کچھ کہتے ہیں۔ مجھے تیری ماں کے لئے گھر میں دیا جلانا ہوگا۔ تو ایسا کر مجھے اس نوکر کے ساتھ بھیجنے کا انتظام کر دے۔''

وہ باپو جی کی گود میں سر رکھ کر دیر تک روتی رہی اور وہ بہتی آنکھوں سے اُسے چپ کراتے رہے وہ سمجھ گئی تھی کہ باپو جی سب جان چکے ہیں۔

اُسی شام وہ خود نوکر کو ساتھ لے کر باپو جی کو گاؤں چھوڑنے آ گئی۔ اس نے دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔ جتنے دن جگدیو نہیں لوٹتا وہ ان کے ساتھ گاؤں میں ہی رہے گی۔ اُن کے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ جلدی جانے کو راضی نہیں ہوئی۔

''باپو جی جگدیو آپ کو میرے حوالے کر کے گیا تھا وہ آ جائے تو میں اپنے گھر لوٹ جاؤں گی۔''

اور ماسٹر جوگندر سنگھ ترپت کی تصویر سے باتیں کرتے نم آنکھوں سے کہہ رہے تھے۔

''ترپت کورے زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ تو دیکھ رہی ہے نا۔ اب عورت کمزور نہیں ہے۔ مرد پردھان معاشرے کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوگئی ہے۔ بادل چھٹ رہے ہیں۔ آسمان کھل رہا ہے۔''

☆☆

رفاقتوں کا سفر

خوبصورت پہاڑیوں میں بسا ایک چھوٹا سا شہر ڈلہوزی اور اس کی گود میں دُلہن کی طرح سجی یہ بڑی سی حویلی کچھ سال پہلے چھوٹا سا مکان ہوا کرتا تھا۔ کشن اور اس کی شریکِ حیات نے اپنی زندگی کی شروعات یہیں سے کی۔ تنکا تنکا جوڑ کر آشیاں بنایا اُسے سنوارا سجایا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کا پیار بھی جوان ہوتا گیا رشتے مضبوط ہوتے گئے اور پریوار بڑھتا گیا بچوں کی کلکاریاں گونجنے لگیں۔ شرارتیں بڑھنے لگیں اور اٹکھیلیاں ہونے لگیں۔ خوشیاں آئی بہار لائی اُنہیں بھی محبت کی فضا راس آئی اور پھر خوشیوں نے اپنا ڈیرا وہیں ڈال لیا۔ ہنسی خوشی موج مستی میں پندرہ سال کب گزر گئے اُنہیں پتا ہی نہ چلا۔ پھر ایک روز بہاروں کا من وہاں سے اُکتا گیا اور وہ اس کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔ پانچ بچوں کی ذمہ داری اُس کے کاندھے پر ڈال کر وہ اسے اکیلا چھوڑ کر بھگوان کو پیاری ہوگئی۔ اس کے علاج میں اس نے کوئی کسر نہ چھوڑی کوئی ڈاکٹر حکیم، کوئی مندر مسجد، کوئی پیر فقیر کچھ بھی نہ چھوڑا مگر اُسے روک نہ سکا۔ دونوں نے ساتھ جینے اور مرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر وہ اس سے بے وفائی کر گئی۔ وہ اس کے ساتھ جی نہ سکی اور وہ اس کے ساتھ مر نہ سکا۔ وہ زندہ تو تھا مگر زندگی تو وہ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔ وہ تو سوچتا تھا کہ اس کے بنا وہ ایک دن بھی زندہ نہیں رہ پائے گا پر یہاں تو بیس سال گزر گئے پھر بھی وہ زندہ ہے۔ یہ بات اور ہے کہ وہ اس کی یادوں کے حصار میں ابھی بھی بندھا ہوا ہے۔ اُسے اپنے کمرے میں آج بھی اُس کی

موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اُس کے جسم کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ کسی کو اجازت نہیں اس کے کمرے کی چیز کو اس کی جگہ سے ہلانے کی۔ آج بھی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی پڑا ہے۔ جس طرح اس نے سجایا تھا۔ اس نے گھر گرہستی کی ذمہ داریاں اکیلے ہی نبھائی۔ یاروں دوستوں نے بہت کہا تھا کہ تم ابھی جوان ہوا کیلے زندگی کیسے گزارو گے اور پانچ پانچ بچوں کی پرورش کیسے کرو گے۔ دوسری شادی کرلو۔ مگر کسی دوسری عورت کو اس کی جگہ دینے کو وہ راضی ہی نہ ہوا۔ اکیلے ہی زندگی کا سفر طے کرنے کی ٹھان لی۔ وہ صرف اس کی شریک حیات ہی نہیں اُس کا پیار اُس کی زندگی تھی۔ اس کے نس نس میں بسی تھی۔ دل وجان سے چاہا تھا اسے۔ وہ تو اُسے پہلی نظر میں ہی اپنا دل اس کے سامنے ہار گیا تھا۔ بنا اُس کے بارے میں کچھ جانے وہ عشق کی آگ میں کود گیا تھا۔

وہ تھی ہی بہت خوبصورت، صورت اور سیرت دونوں سے۔ کھلا ہوا رنگ، گلابی ہونٹ، موٹی موٹی کالی آنکھیں، تیکھی پلکیں، چھوٹی سی ناک، لمبا قد، تراشا ہوا بدن، بنانے والے نے کسی طرف سے کوئی بھی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ اُسے وہ پہلی نظر میں ہی بھا گئی۔ جب بھی وہ اس کے سامنے آتا اُسے دیکھتا تو اس کے چہرے سے نگاہیں نہیں ہٹا پاتا تھا۔ ایک بات تھی جو اس کے دل کو چھلنی کر دیتی تھی وہ تھا اُس کا سفید لباس۔ وہ رنگ جس نے اس کی زندگی سے سارے رنگ چرا لئے تھے۔ جس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ رنگ برنگی زندگی ابھی اس نے دیکھی بھی نہ تھی کہ اُس کی زندگی سے ہر رنگ غائب ہو گیا تھا صرف سفید رنگ ہی اس کی پہچان بن گیا تھا۔ وہ بال ودھوا تھی۔ گڑیا گڑے کی طرح اُس کی شادی بچپن میں رچا دی گئی۔ جس کی اُسے یاد بھی نہیں اور پھر کچھ سالوں بعد جوانی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی اُس کا پتی جس سے وہ کبھی ملی نہیں، جس کی کبھی اُس نے صورت نہیں دیکھی اور جس کے ساتھ وہ دو قدم بھی نہیں چلی، اس زندگی کی راہ میں اُسے تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ سہاگ اُجڑنے کا غم کیا ہوتا ہے اُسے یہ بھی نہیں معلوم اُسے تو بس اتنا پتا ہے کہ وہ زندگی بھر تنہا رہے گی۔ اُسے یہ سفر اکیلے ہی کاٹنا ہے۔ منحوس کا خطاب جو اُس کو مل چکا ہے۔ دنیا والے اُسے منحوس

سمجھتے ہیں مگر اس کے ماں باپ اُس کے بھائی اُسے گھر کی رونق سمجھتے ہیں۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن...... ماں باپ کی لاڈلی پھر بھی سماج کے اندھے بندھنوں میں بندھی ہوئی۔

کشمیر کی وادیوں میں بسا ایک چھوٹا سا شہر بھدروا جس میں رہنے والے ایک براہمن پریوار میں اُس نے جنم لیا۔ وہی کھیل کود کر بڑی ہوئی۔ بھدروا کی خوبصورتی تو دیکھنے والے ہی جان سکتے ہیں لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی کہاں ہے۔ ہر طرف ہریالی دیودار اور چنار کے درخت اور پاس ہی بہتی نیرو ندی۔ وہاں کی رم جھم برستی برسات، پھلوں سے مہکتی بہار اور سفید برف سے ڈھپی ہوئی سردی۔ ہر موسم کا اپنا ہی الگ انداز اور اپنا ہی لطف۔ جو ایک بار یہ اسیر موسم دیکھ لے وہی کا ہو کر رہ جائے۔

کشن کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ پیشاور میں جنم لیا وہی بچپن گزرا۔ جوانی ابھی آئی بھی نہ تھی کہ گھر والوں کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے گھر کے سبھی فرد ہیضہ کے شکار ہو گئے۔ اس مہاماری نے گھروں کے گھر اُجاڑ دئے۔ شہر خالی ہو گئے۔ موت کا تانڈو دیکھ وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ بات ان دنوں کی ہے جب ملک ایک تھا نہ بٹوارہ ہوا تھا نہ سرحدیں تھی۔ کئی دن کئی ماہ وہ جگہ جگہ بھٹکتا رہا اور آخر میں ایک بار جو بھدروا آیا تو وہی کا ہو کر رہ گیا۔ اُس نے اُس جگہ کو اپنایا تو وہاں کے لوگوں نے اُسے اپنا لیا۔ پھر نیونا بھی تو وہیں تھی۔

نیونا سے اُس کی پہلی ملاقات اُسی کے گھر میں ہوئی۔ پنڈت دیودت گوسائی اپنے پریوار کے ساتھ اپنے پشتینی گھر میں رہتے تھے۔ گھر کے اگلے حصے میں بڑی سی دکان تھی۔ پرچون کا کام کرتے تھے۔ اُن کا بڑا بیٹا مادھو گوسائی ان کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ دونوں چھوٹے بیٹے پڑھائی کرتے تھے اور بیٹی گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ کشن چھاؤنی میں ٹھیکیداری کا کام کرتا تھا جب کبھی بھی اُسے سامان کی ضرورت ہوتی تو وہ انہیں کی دکان سے سامان لیتا۔ مادھو اس کا ہم عمر تھا اس لئے دونوں میں دوستی بھی ہو گئی۔ اسے نہ صرف ایک اچھا دوست ملا بلکہ ایک پیار کرنے والا پریوار بھی مل گیا۔ جب بھی وہ اُن

کے گھر جاتا دونوں چھوٹے بھائیوں سے خوب شرارتیں کرتا۔ ماں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔ کشن تھا بھی پیار کے قابل خوش طبیعت، حساس دل، درد مند اور خوش اخلاق انسان۔ نیونا کو پہلی بار اُس نے گھر پر ہی دیکھا تھا۔ وہ ماں کے کہنے پر چائے لے کر آئی تھی۔ اُس پر نظر پڑتے ہی وہ ہوش کھو بیٹھا تھا۔ مادھو نے تب اُسے بتایا تھا کہ وہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ دونوں میں خاموشی کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ جب وہ گھر پر بھی جاتا تو وہ چائے پانی کھانا دینے ہی اس کے سامنے آتی یا کام کرتے کرتے اُن کی باتیں سنتی رہتی۔ کن انکھیوں سے اسے دیکھتی رہتی اور مسکراتی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ کشن اُسے چاہتا ہے۔ پسند تو وہ بھی اُسے کرتی تھی۔ اس کے کورے دل پر کشن نے ہلکے سے دستک دی تھی اور اپنا نام لکھ دیا تھا جیسے وہ سب سے چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ اس کے لئے غیر مرد تھا جس کا تصور بھی دنیا کی نظر میں پاپ تھا۔ کشن کے سامنے جب بھی وہ آئی اس کا چہرا شرم سے لال ہو جاتا اور قدم لڑکھڑانے لگتے اور یہ کیفیت کشن سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ اپنے دل میں پنپتی تمناؤں کو دبانے لگا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کی خواہشات، اُسے پانے کی آرزو، اُس کے ساتھ زندگی گزارنے کی تمنا بڑھتی گئی۔ ایک روز وہ اپنے دل کے ہاتھوں اتنا مجبور ہو گیا کہ اُس نے مادھو سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ مادھو کو سن کر نا تعجب ہوا نا غصہ آیا۔ وہ خاموشی سے سب سنتا رہا اور پھر بنا کچھ کہے اُٹھ کر چلا گیا۔ مادھو جانتا تھا کہ اس کا دوست بے عیب، محنتی، سچا اور اچھا انسان ہے۔ دیکھنے میں بھی وہ کسی سے کم نہیں۔ لمبا قد، چوڑا سینا، کالے گھنے گھنگھرالے بال، گندمی رنگ، گھنی مونچھے اور ہمیشہ سفید پٹھانی شلوار قمیض، طرہ والی پگڑی اور واسکٹ میں وہ بچ بچ جاتا تھا۔ کئی جوان بیٹیوں کے ماں باپ کی نظر تھی اس پر۔ مادھو اپنی چھوٹی بہن سے بے حد پیار کرتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ زندگی بھر وہ تنہائی کی سزا کاٹے مگر اپنے بابا کے خیالات سے وہ بخوبی واقف تھا جو سماج کے رسم و رواج میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ اس کی مجبوری نے اس کے لب سل دئے تھے ورنہ وہ اس طرح اٹھ کر نہ چلا آتا۔

کئی روز گزر گئے کشن مادھو سے نہیں ملا وہ اُس سے بچتا رہا۔ بے خودی میں اُس

نے اپنے دل کی بات کہہ تو دی تھی مگر اس کا اثر مادھو پر کیا ہوگا یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔ اپنے آپ میں کڑتا رہا، گھلتا رہا۔ ایک ہی شہر میں نیونا اور اس کے پروار سے انجان بن کر رہنا اُسے گوارا نہ تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک سہانی شام اداس اور بھاری من سے اس کے قدم خود بخود داس کی منزل کی طرف بڑھنے لگے۔ اسے دیکھتے ہی مادھو اُس سے بڑے تپاک سے ملا جیسے کبھی کچھ اُن دونوں کے بیچ ہوا ہی نہ ہو۔ جھٹ سے اُٹھ کر اندر جا کر چائے کا بھی کہہ آیا۔ ''کیا بات کچھ اداس لگ رہا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے''؟ مادھو جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

''بس ٹھیک ہی ہے۔ میں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔''

''کیا'' اُس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''میں نے تمہارا شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں دو تین روز میں چلا جاؤں گا۔''

''کہاں جائے گا''؟

''ڈھلہوزی! میرا ایک دوست رہتا ہے وہاں۔ ایک ملٹری افسر سے بات کی ہے۔ وہاں چھاونی میں کام مل جائے گا۔''

''اور یہاں کا کام''؟

''وہ میں نے بات کر لی ہے''۔

''یعنی سب کچھ طے کر کے ہی آیا ہے''۔

''شاید اتنا ہی ساتھ لکھا تھا تم لوگوں کے ساتھ''۔

اتنے میں نیونا چائے کی دو پیالیاں لے کر آ گئی۔ کشن نے منہ اٹھا کر ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ آنکھیں نیچے کئے بیٹھا رہا اور وہ چپ چاپ چائے رکھ کر چلی گئی۔ دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ مگر دونوں کے دل و ذہن میں کئی باتیں، کئی سوال انہیں پریشان کر رہے تھے جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مادھو نے ہی چپی توڑی۔

"مل کر تو جائے گا"؟

"بالکل مل کر جاؤں گا۔ گھر پر سب سے ملوں گا۔ اس گھر سے مجھے بے حد پیار اور اپنا پن ملا ہے بھلا ایسے کیسے چلا جاؤں گا۔ ماں کے ہاتھ کا کھانا کھا کر ہی جاؤں گا۔ ان کا آشیر باد بھی تو لینا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ بھاری من سے وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کتنی آسانی سے مادھو نے اس کے جانے کے فیصلے کو قبول کر لیا۔ ایک بار بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کہاں گیا وہ اپنا پن کہاں گئی وہ دوستی؟۔ کیا انسان کی خوشیاں سماج کے رسم و رواج سے زیادہ اہم ہیں؟ یہ ہی سب سوچتا سوچتا وہ گھر لوٹ آیا۔

تین دن بعد اپنا سب سامان سمیٹ کر رکھ دیا۔ سب جان پہچان والوں سے جانے کی اجازت بھی لے لی۔ سبھی کو یہ ہی کہا کہ اسے یہاں سے اچھا ٹھیکا مل گیا ہے اسی لئے اُسے بھدروا چھوڑنا پڑ رہا ہے۔

بھدروا میں آخری شام اس نے گوسائی پروار کے ساتھ ہنستے کھیلتے بتائی۔ اس نے اپنا درد ہنسی کے پیچھے چھپا لیا کسی کو اپنی تکلیف کی بھنک تک نہ پڑنے دی۔ البتہ نیونا کا اترا ہوا چہرا دیکھ کر اسے دکھ تو بہت ہوا ساتھ میں تسلی بھی تھی کہ اسے بھی اس سے بچھڑنے کا غم ہے۔ وہ چاہتا تو تھا اپنے دل کی ایک ایک بات اس سے کہہ دے۔ نہ حالات نے اجازت دی اور نہ دل نے ہمت کی۔ جس افسانے کو کوئی انجام تک نہ پہنچایا جا سکے اُس کا ذکر ہی کیوں کرنا۔ پھر زندگی میں دوبارہ ملنے کی امید لئے اور ماں بابا کا آشر باد لئے وہ اس گھر کو چھوڑ آیا۔ سبھی اسے باہر تک چھوڑنے آئے مگر نیونا دروازے کے پیچھے کھڑی چوری چوری اسے دیکھتی رہی سامنے نہیں آئی۔ وہ گھر اور وہ شہر ہمیشہ کے لئے چھٹ گیا۔

نئی جگہ نئے ماحول نئے کام اور نئے لوگوں سے خود کو...... آہنگ کرنے کی کوشش میں لگ تو گیا مگر وہ بھدروا اور نیونا کو نہیں بھلا پایا۔ خوش اخلاق اور ملنسار تو وہ تھا ہی، بہت جلد بیگانوں کو اپنا بنانے کا ہنر بھی اُسے آتا تھا۔ سارا دن تو وہ کام کاج میں مصروف رہتا اور

جب رات کو خالی گھر میں لوٹا تو گھر کے در و دیوار اسے کاٹنے کو دوڑتے۔ اس وقت صرف اس کے ادھورے خواب، اس کی ناکام حسرتیں ہی اس کے پاس ہوتیں رات کو وہ جاگتی آنکھوں سے نیونا کے سپنے دیکھتا اور صبح ہوتے ہی حقیقت اُس کا منہ چِڑانے لگتی۔

تین چار مہینے اسی طرح گزر گئے پھر ایک روز مادھو کا خط اسے ملا۔ لکھا تھا کہ وہ کسی کام سے وہاں آ رہا ہے اور اس کے پاس ہی رکے گا۔ اس دن سے اسے مادھو کا بے صبری سے انتظار شروع ہو گیا۔ مادھو آیا تو اس کے ساتھ بھدروا میں بیتے ہوئے دن بھی لوٹ آئے تھے۔ بہت دیر تک بیتے دنوں اور وہاں کے لوگوں کی باتیں ہوتی رہی۔ پھر اچانک مادھو نے باتوں کا رخ بدل دیا۔

"ایک روز تم نے مجھ سے کچھ کہا تھا"۔

"مگر تم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا"۔

"مجھے وقت چاہیے تھا"۔

"میں نے تو ساری عمر دے دی"۔

"ساری عمر؟ ابھی تو عمر کی شروعات ہوئی ہے۔ ابھی تو تم نے ایک نئی زندگی شروع کرنی ہے۔ مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہو۔"

"تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔"

"میں آج تمہارے لئے کچھ لے کر آیا ہوں۔"

"کیا"؟

"تمہاری تمنا، تمہاری آرزو، تمہاری زندگی اور میری جان سے بھی پیاری چھوٹی بہن"۔

"کیا؟ ماں بابا مان گئے"؟ اُسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

"نہیں۔ میں نے ماں سے بات کی تھی وہ تو میرے ساتھ سہمت تھی خوش بھی بہت تھی۔ تم تو جانتے ہو تمہیں پسند بھی بہت کرتی ہیں۔ ہم نے بابا کو ٹٹولنا چاہا مگر قدامت

پرستی اُن کی رگ رگ میں بسی ہے جیسے وہ کبھی چھوڑ نہیں سکتے''۔

''پھر''؟

''پھر کیا؟ میں نے اور ماں نے ایک ترکیب سوچی۔ بابا اور ماں سے اجازت لے کر ہم چمپا ماتا کے درشن کے لئے نکلے ہیں''۔

''نیونا کہاں ہے؟ تمہارے ساتھ آئی ہے''؟

''اسے مندر میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ یہاں تو لا نہیں سکتا تھا۔''

''اب؟''

''میں مندر میں پنڈت جی سے بات کر کے آیا ہوں۔ اگر تم راضی ہو تو چلو اور شادی کرا کر اسے گھر لے آؤ''

خوشی کے مارے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اپنی قسمت پر اسے رشک ہونے لگا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو نا؟ ماں بابا کو جا کر کیا جواب دو گے''؟

''ڈرامہ کرنا پڑے گا''۔

''وہ کیا؟''

''رونا دھونا پڑے گا۔ کہہ دوں گا کہ چلتے چلتے نیونا کا پیر پھسل گیا اور وہ راوی کے تیز بہاؤ میں بہہ گئی بہت تلاش کیا مگر کچھ پتا ہی نہ چلا۔''

''یہ تو غلط ہوگا''۔

''پیار بھی کرتے ہو اور ڈرتے بھی ہو۔ بتاؤ کیا غلط ہوگا؟ دو پیار کرنے والے مِل جائے گے اور دو زندگیاں برباد ہونے سے بچ جائے گی۔ ہاں اس بات کا افسوس رہے گا کہ دوبارہ تم لوگوں سے مل نہیں سکوں گا۔ بس ایک وعدہ کرو میری بہن کو ہمیشہ خوش رکھو گے۔''

''اپنی جان سے بھی زیادہ خیال رکھوں گا۔ ہمیشہ خوش رکھوں گا تمہیں اپنے فیصلے

پر کبھی شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔''

''یہ ہماری شاید آخری ملاقات ہوگی۔ میں نہیں چاہتا کبھی کسی کو تمہاری اور نیونا کی شادی کی بھنک بھی پڑے۔''

اس رات وہ اپنی بہن اور دوست کو نئی زندگی عطا کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا تھا۔

پچیس سال گزر گئے کسی نے کبھی پلٹ کر ادھر نہیں دیکھا۔ بھدرروا والوں کے لئے نیونا کا قصہ برسوں پہلے ختم ہو چکا تھا۔ اتنے عرصے بعد ایک بار پھر امید جاگی تھی۔

آج پھر کشن کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی پر اُس کے ننہال سے اکلوتے رشتے دار اور اُس کے جگری دوست مادھو کا انتظار تھا۔

☆☆

اور طلسم ٹوٹ گیا

اسے اس طرح اس جگہ اس وقت اپنے سامنے دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ میں نے تو کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس طرح ہماری ملاقات ہوگی۔ میری اس سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ دسویں میں پڑھتی تھی۔ لمبا قد، تراشا ہوا بدن، کھلتا ہوا رنگ، گہری شربتی آنکھیں اور معصوم چہرہ۔ بالکل تروتازہ کھلتے ہوئے گلاب کی طرح۔ ایک بار جو اسے دیکھ لے تو دوبارہ دیکھنے کو جی مچل اٹھے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میری موسی کی بیٹی نلنی کی شادی میں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ موسی کے جان پہچان والوں میں سے تھی۔ اس پر نظر پڑی تو میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پہلی بار میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں کی آواز سنی شاید اس سے پہلے دل کبھی اتنی زور سے دھڑکا نہیں تھا۔ میری چوری نلنی نے پکڑ لی۔ اور اس طرح سے میری حالت دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسی کہ میں سنبھل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ بھی شرم سے لال ہو رہا تھا۔

نلنی نے ہمارا تعارف اس طرح کروایا:

''یہ پیاری سی معصوم خوبصورت لڑکی انجلی ہے۔ ابھی کم سن ہے پر بڑے بڑوں کے ہوش اڑا دیتی ہے۔ بہت ہی خوش مزاج بے حد فرمابردار، خوش اخلاق اور............''

''بس بس دیدی اتنی تعریف بھی اچھی نہیں۔''

اس کی آواز میں بھی مٹھاس تھی۔

''ایک انسان میں اتنی خوبیاں ہو سکتی ہیں؟ یہ تو دیکھنا پڑے گا۔''

''ابھی بہت دن یہاں پر ہو، دیکھ بھی لینا اور پہچان بھی لینا۔ اور تم انجلی میرے اس بھائی سے ذرا بچ کر رہنا بہت ہی شرارتی اور چالاک ہے اپنی میٹھی باتوں میں پھانسنے کا ہنر بہت اچھے سے جانتا ہے۔ پھر مت کہنا دیدی نے آگاہ نہیں کرا۔''

پوری شادی میں وہ میری نگاہوں کا مرکز بنی رہی۔ اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا۔ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ پڑھائی میں بھی ہوشیار اور بڑی اچھی تیراک۔ اپنے اسکول کے لئے کئی میڈل جیت چکی تھی۔ زندگی میں بہت کچھ کر دکھانے کا جذبہ اس میں تھا۔ شاید اسے زندگی میں سب کچھ چاہیے تھا۔ وہ زندگی میں بہت آگے جائے گی یہ میں نے پیش گوئی کر دی تھی۔

''کوئی جوتش وغیرہ سیکھا ہے؟'' نلنی نے چھیڑا۔

''بالیکا کا بھاگیا اس کے چہرے سے پڑھا جا سکتا ہے۔''

''اور پنڈت جی میرا چہرا کیا کہتا ہے؟'' انجلی کے پاپا نے اپنا چہرہ آگے کرتے ہوئے کہا۔

سبھی کھلکھلا کر ہنس پڑے اور شادی کے دو چار دن موج مستی میں کیسے بیتے پتا ہی نہیں چلا۔

شادی کے بعد میں واپس اپنے شہر لوٹ آیا مگر انجلی میرے ذہن و دل پر چھائی رہی۔ نہ جانے کتنی کشش تھی اس کے چہرے اور شخصیت میں کہ مجھے اس کے بعد کبھی کوئی لڑکی بھائی ہی نہیں۔ بی اے پوری کرتے ہی میں نے پولس آفیسر کے امتحان پاس کر لئے اور ٹریننگ پر جانے سے پہلے ایک بار پھر میں موسی کے گھر گیا تو پتا چلا کہ آگے کی پڑھائی کے لئے وہ چنڈی گڑھ جا چکی ہے۔

آگے سے زیادہ خوبصورت اور اسمارٹ ہو گئی ہے۔ دل نے چاہا کہ اس کا پتا لے لوں اور ایک بار اسے مل کر ضرور آؤں مگر چاہتے ہوئے بھی میں ایسا نہ کر سکا۔

دوسری ملاقات بہت مختصر اور اچانک ہوئی۔ میں ممبئی وی ٹی اسٹیشن پر گاڑی میں سامان رکھ کر کتابوں کے اسٹال پر راستے کے لئے کوئی رسالہ دیکھنے اترا تو میری نظر چار پانچ خوبصورت، اسمارٹ لڑکیوں کے گروپ پر پڑ گئی جو ایک دوسرے سے مزاق اور مستی میں مصروف تھیں۔ اس عمر میں عموماً ہر چھوٹی بات پر ہنسی چھوٹ جاتی ہے اور کبھی کبھی بے وجہ ہی قہقہہ لگا کرتے ہیں۔ گاڑی کے انتظار میں کھڑے لوگ ان لڑکیوں کو ہی دیکھ رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک چہرہ جانا پہچانا لگا۔ حلیہ بدل چکا تھا مگر شکل وہی تھی جو کئی سالوں سے اس دل میں سمائی تھی۔ بھلا اسے میں کیسے نہ پہچانتا۔ ہزاروں کی بھیڑ میں بھی وہ چہرہ پہچان لیا۔ جب میں اس سے چار سال پہلے نلنی کی شادی میں ملا تھا وہ سیدھی سادی معصوم شلوار قمیض پہننے والی لڑکی تھی اور اب ٹائٹ جینس، چھوٹی ٹاپ، لمبے کھلے رنگے ہوئے بال اونچی ایڑی کی سینڈل دیکھنے والا سمجھے کہ بڑی اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے کوئی جان ہی نہیں سکتا کہ یہ متوسط طبقے کی لڑکی ہے۔ بنا بلائے مجھ سے رہا نہ گیا۔

''انجلی'' اپنا نام سن کر وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر شاید ذہن پر زور ڈالا اور اس کے چہرے کے تاثر سے ظاہر ہو گیا کہ وہ پہچان گئی ہے۔ گروپ میں سے نکل کر میری اور بڑھی۔ آ کر ہاتھ ملایا۔

''کیسے ہیں آپ اور یہاں کیسے؟''

''میں کسی کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ گاڑی تیار کھڑی ہے۔ تم یہاں کیسے؟''

''میں اپنی دوستوں کے ساتھ ماڈلنگ کی ایک assignment کے سلسلے میں آئی تھی۔''

''پڑھائی چھوڑ دی؟''

''بالکل نہیں۔ یہ ماڈلنگ تو پارٹ ٹائم ہے۔ پڑھائی بالکل جاری ہے۔ آپ آج کل کہاں ہوتے ہیں؟''

''میں دلی میں ہوں آج کل۔ اتنے سالوں میں کبھی ہمارا خیال بھی آیا؟''

''آپ دوبارہ ملے ہی نہیں۔ ایک بار گئے پھر پلٹ کر بھی نہ دیکھا بھلا یاد کیسے رہتے؟'' اس نے ہنس کر جواب دیا۔

''اپنا پتا دے دو۔ اب یہ غلطی دوبارہ نہیں ہوگی۔''

ابھی وہ پرس میں سے کاغذ اور قلم نکال ہی رہی تھی کہ میری گاڑی چلنے کا اعلان ہو گیا۔ میں نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا اور اس کی تصویر اس میں قید کر لی۔ گاڑی اب رینگنے لگی تھی اور وہ مجھ سے میرا فون نمبر پوچھ رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اسے الوداع کہتے میں نے اپنا نمبر لکھا دیا۔ پتا نہیں وہ نمبر ٹھیک سے لکھ بھی پائی کہ نہیں کیونکہ مجھے اس کا کبھی فون نہیں آیا۔ گاڑی پر سوار تو میں ہو گیا اور دیر تک اس ہاتھ کی طرف دیکھتا رہا جو ہوا میں لہرا رہا تھا۔ ممبئی سے دلی کا راستہ بہت خوبصورت رہا۔ اس کی تازہ تصویر میرے موبائل میں قید تھی نہ جانے کتنی دیر میں اس تصویر کو دیکھتا رہا اس سے باتیں کرتا رہا۔ اسے تو شاید یہ علم بھی نہ ہوگا کہ اس کی پہلی ملاقات کا جادو اب تک برقرار تھا اور اب یہ اچانک دوسری ملاقات کا اثر کیا ہوگا یہ خدا جانے۔ دو تین بار چنڈی گڑھ جانے کا پروگرام بنا مگر کام کی مصروفیت کے باعث میں چاہتے ہوئے بھی وہاں جا نہیں سکا۔

اور آج چار مہینے بعد اس تیسری اور شاید آخری ملاقات میں اس نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پنجابی گروپ کی حرکتوں پر پولس پریشان ہے اور جس کا چرچا ہائی سوسائٹی میں عام ہے وہ بھی اس گروپ میں شامل ہے۔ پچھلے کچھ مہینوں سے یہ گروپ حرکت میں آیا ہے۔ پولس کو اطلاع ملی تھی کہ کالج کی کچھ لڑکیاں Weekend پر ہونے والی پارٹیوں میں جاتی ہیں۔ یہ گروپ پندرہ لڑکیوں کا ہے اور ان کی اڈوانس بکنگ ہوتی ہے۔ بڑے بڑے بزنس مین ان کو بک کرواتے ہیں۔ یہ گروپ چنڈی گڑھ، دہلی، ممبئی جیسے شہروں میں جاتا ہے۔ بکنگ کرنے والا سامنے نہیں آتا۔ آنے جانے کا فرسٹ کلاس کرایہ، پانچ ستارہ ہوٹل میں کمرا اور نقد ایک لاکھ روپیہ ایک بے نام کھاتے میں جما ہو جاتے ہیں۔ ان کا نیٹ ورک اتنا زبردست ہے کہ پولس ان تک پہنچ نہیں پا رہی ہے۔ پولس کے پاس اتنی رپورٹ ہے کہ یہ گروپ ان طلبہ کا ہے جو کسی مجبوری کے تحت نہیں بلکہ عیش کی زندگی گزارنے کے لئے اور

صرف موج مستی کے لئے ہفتے میں ایک بار یہ تفریح کرتی ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں جانا اچھی شراب پینا اور رات بھر غیر مرد کی ضرورتیں پوری کرنا ان کا شوق ہے۔ایسے گروپ کا خاتمہ کرنا نہایت ضروری ہے جو ناسور کی طرح نئی نسل کو اپنی چپیٹ میں لے رہا ہے۔ایسی کئی لڑکیوں کو دھیرے دھیرے مُلک کے خلاف مخبری کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔اس کیس کی ذمہ داری میری قابلیت دیکھ کر مجھے سونپی گئی تھی۔شہر کی مختلف بزنس پارٹیوں میں ایک بزنس مین کی حیثیت سے شریک ہونا شروع کیا۔اپنے قریبی دوست کے ذریعۂ جو خود ایک نامی بزنس مین تھا کچھ لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ایسی ہی ایک پارٹی آج شہر کے پانچ ستارہ ہوٹل میں رکھی گئی تھی۔اس میں جو ڈیل ہوئی تھی میں نے بھی اپنی رضامندی دے دی تھی۔ میں تو اس پل کا ایک مدت سے انتظار کر رہا تھا۔آج مجھے کچھ عزت دار لوگوں کو بے نقاب کرنے کا موقعہ ملا ہے جس کے لئے میں نے کئی پلان بنائے اور اس کیس کو سلجھانے کی جدو جہد میں لگا رہا۔کچھ دیر جام کے دور چلتے رہے پھر پانچ آدمی وہاں سے پارٹی میں سے اُٹھے اور ہوٹل میں بک کئے ہوئے کمروں کی طرف چل پڑے اُن پانچ میں سے میں بھی ایک تھا۔کمرا نمبر ۵۰۶ کے دروازے پر جا کر میں نے دستک دی تو اندر سے سریلی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرا گئی۔

''کم ان''

کمرے میں داخل ہوا تو مدھم سی روشنی میں ایک لڑکی صوفے پر ہاتھ میں شراب کا گلاس لئے بیٹھی تھی۔جیسے ہی میری نظر اس سے ملی میرے ہوش اڑ گئے میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔مجھے دیکھ کر وہ ایک پل کے لئے چونکی اور پھر اس طرح سے دیکھا جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہو میں کوئی انجان اجنبی شخص اس کے سامنے کھڑا ہوں۔یہ میری انجلی نہیں ہوسکتی جو انجان بن کر آرام سے چسکیاں لے رہی تھی اور جس کے چہرے پر نہ شرم وحیا اور نہ ندامت کے آثار تھے۔میرے قدم وہی جم گئے تھے۔میرے سپنے ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گئے۔ایک طلسم تھا جو ٹوٹ گیا۔دل نے چاہا دروازے سے ہی انجان بن کر لوٹ جاؤں جیسے میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں میں کچھ سمجھا ہی نہیں مگر فرض نے میرے قدم آگے بڑھا دئے۔ ☆☆

بندھے ہاتھ

چپراسی نے آکر خبر دی کہ مرحوم بلراج ٹھاکر کی بیوہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔میں نے سب کام اُسی وقت چھوڑ دیا اور اُنہیں اندر بھیجنے کے لئے کہہ دیا۔بلراج ٹھاکر میرے ماتحت کام کرتا تھا۔بہت ایماندار،خوش طبیعت سجیلا بانکا نوجوان،اپنی بات اور اصولوں کا پکّا۔کبھی کسی کے دباؤ میں آکر کام نہیں کیا۔کبھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دی۔کئی بڑے افسر اُس کے قلم کی تیز دھار سے گھبراتے تھے۔سرکاری دفتر میں ایسے ملازم کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔بدقسمتی سے ایک رات وہ ایسا سویا کہ پھر صبح کا منہ نہیں دیکھ سکا۔بیوی اور دونوں بچّوں کو بے سہارا چھوڑ گیا۔میں کبھی اُس کی بیوی اور بچّوں سے ملا نہ تھا۔سُنا ضرور تھا کہ اُس کی بیوی بہت خوبصورت ہے اور اسی لئے وہ اُسے کہیں اکیلے آنے جانے نہیں دیتا۔اور نہ ہی زیادہ دوستوں کو اُسے اپنے گھر بلانا پسند ہے۔

تقریباً آٹھ سال پہلے جب پہلی بار وہ میرے دفتر اپنے بیٹے کو لے کر آئی تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔خوبصورتی کا مجسمہ میرے سامنے تھا۔عمر چالیس کے قریب ہوگی مگر اپنی عمر سے وہ کہیں چھوٹی لگتی تھی۔رنگت ایسی جیسے مکھن میں سیندور ملا ہو۔موٹی موٹی شربتی آنکھیں،چھوٹا سا ناک،بھرے بھرے گلابی ہونٹ،معصوم چہرہ اور پُرکشش سڈول جسم۔سفید شلوار قمیض اور سر پر سفید دوپٹہ۔سوگوار چہرے سے بھی نور ٹپک رہا تھا۔پاکیزگی اتنی کہ میں دو منٹ بھی اُس کے چہرے پر نظریں نہ ٹکا سکا۔

''شرما صاحب! مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ میری نوکری کے لئے سفارش کر رہے ہیں۔''

''آپ قانوناً اس نوکری کی حقدار ہیں۔ میں تو صرف کوشش کر رہا ہوں کہ ٹھاکر صاحب کے پریوار کی مدد کروں اور جلد سے جلد آپ کا کام ہو جائے۔''

''میں آپ سے گزارش کروں گی کہ میری جگہ میرے بیٹے کو نوکری دے دی جائے۔''

''کیا عمر ہے بیٹا تمہاری؟'' میں نے نوجوان کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سر! اُنیس سال۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''بی۔اے فائنل میں ہوں۔''

''جیسا آپ چاہتی ہیں، ویسا ہو سکتا ہے۔ مگر میری ذاتی رائے ہے کہ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ آپ کو یہ نوکری کر لینی چاہیئے۔ ویسے بھی آپ کو کہیں اور نوکری تو مل نہیں سکتی مگر آپ کے بیٹے کو پڑھائی مکمل کر کے کہیں نہ کہیں نوکری مل ہی جائے گی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی اسے اور پڑھنے دو۔ پھر نوکری کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

''شرما صاحب! میں کبھی گھر سے باہر اکیلی نہیں نکلی۔ مجھے تو گھر کے علاوہ کسی اور دنیا کی جانکاری ہی نہیں۔ پھر ٹھاکر صاحب کو میرا نوکری کرنا پسند بھی نہیں تھا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر حالات کے ساتھ خود کو بدل لینا چاہیئے۔ بھگوان نہ کرے اگر کل کو آپ کا بیٹا آنکھیں پھیر لے تو آپ کیا کریں گی؟ ابھی آپ کو اپنی بیٹی کی ذمہ داری بھی پوری کرنی ہے۔''

''مجھے اپنے خون اور اپنی پرورش پر پورا بھروسہ ہے۔ میرا بیٹا کبھی مجھے دغا نہیں دے سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔ تو پھر آپ ایک عرضی لکھ کر دے دیں۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد

سے جلد آپ کے بیٹے کو نوکری مل جائے اور جس مکان میں آپ رہ رہے ہیں، وہ اس کے نام پر الاٹ ہو جائے۔''

کچھ ہی دیر میں وہ مجھے درخواست دے کر وہاں سے چلے گئے اور میں نے بھاگ دوڑ کر کے جتیندر ٹھاکر کو نوکری اور سرکاری مکان دلوا دیا۔ میری طرف سے یہ خراجِ عقیدت تھا ایک نیک انسان کے لئے جو بے وقت اپنی ذمہ داریاں ادھوری چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو میں اُنہیں پہچان نہیں پایا۔ سات سال کا عرصہ کوئی زیادہ عرصہ تو نہیں ہوتا۔ چہرے کی دمک غائب تھی۔ آنکھوں میں سونا پن، جسم ڈھلکا ہوا اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آ رہی تھیں۔

''کیسے آنا ہوا مسز ٹھاکر۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟'' اس کی حالت بتا رہی تھی کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

''اب کیا ٹھیک ہوگا شرما صاحب۔'' ایک سرد آہ اُس کے دل سے نکلی۔

''ایک بار پھر آپ سے مدد چاہیئے۔ میری مجبوری پھر مجھے آپ کی چوکھٹ تک لے آئی ہے۔'' وہ اپنی آنکھوں میں آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''ہم سب آپ کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہیں۔ آپ پر جو غم کا پہاڑ ٹوٹا ہے، اس کا علم ہے ہمیں۔ حوادث کا دوسرا نام ہی زندگی ہے۔'' میں جانتا تھا میری تسلی اُس کے زخم پر مرہم نہ رکھ سکے گی۔

''اب حادثوں کو جھیلنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ سوچتی ہوں اُس روز آپ کی صلاح مان لیتی تو سر پر چھت بھی قائم رہتی۔ مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' یہ چھت کا نیا مسئلہ کیا آ گیا، میں سمجھ نہیں پایا تھا۔

''ٹھاکر صاحب کی وفات کے بعد جو دفتر سے رقم ملی تھی، وہ میں نے کچھ تو بیٹی کی شادی کے لئے رکھ لی اور کچھ اُس کی پڑھائی پر لگ گئی، باقی جتیندر کی شادی پر۔ آرام سے گزر بسر ہو رہی تھی کہ جتیندر ایک سڑک حادثے میں چل بسا۔ زندگی تھم سی گئی۔ ابھی رونا

دھونا چل ہی رہا تھا کہ بہو کو اُس کے مائکے والے کچھ دنوں کے لئے لے گئے۔ پھر وہ لوٹ کر نہیں آئی۔ یہاں آتی بھی تو کس لئے؟ پتی کے گزرنے کا صدمہ میں بچوں کی وجہ سے برداشت کرگئی مگر اپنی کوکھ کے اُجڑنے کے صدمے کو برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔ جینے کی رسم نبھانے کے لئے جینا تو پڑے گا۔ بہو کی سونی مانگ دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ مجھے غم سے کہاں فرصت تھی کہ دنیاداری کی سوچتی۔ دماغ نے تو ویسے بھی کام کرنا بند کردیا تھا۔ بس ماں بیٹی ایک دوسرے کے سہارے جینے کی کوشش کررہے تھے کہ دفتر سے مکان خالی کرنے کا نوٹس آگیا۔ اب بھلا میں جوان بچّی کو لے کر کہاں جاؤں؟''

''آپ کی تکلیف ہم سمجھتے ہیں مگر جو کچھ بھی ہوا وہ قاعدے قانون اور اصولوں کے تحت ہی ہوا ہے۔''

''یہ کیسا قاعدہ ہے، کون سا قانون ہے شرما صاحب کہ میری عمر بھر کی کمائی، میرا جوان بیٹا بھگوان نے مجھ سے چھین لیا اور اُس کا سارا پیسہ اور نوکری بہو لے گئی۔''

''مرحوم کی بیوہ ہونے کے ناطے شوہر کی ہر چیز کی وہ قانوناً وارث ہے۔ سب سے پہلے حق اُسی کا بنتا ہے۔'' میں نے دفتری زبان بولتے ہوئے صفائی پیش کی۔

''جس عورت نے بیٹے کو جنم دیا، اُسے پال پوس کر پڑھا لکھا کر پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا اور جس بیوہ بوڑھی ماں نے پچیس سال اپنی ممتا اُس پر نثار کی، دن رات اُسے دیکھ دیکھ کر جیتی رہی، جو اُس کے جینے کا سہارا تھا۔ اُس کا کوئی حق نہیں؟ سارے حق اُسی کے ہوگئے جو سال بھر ہی اُس کے ساتھ رہی؟ کیا وہی اکلوتی وارث ہوگی؟''

اُس کی باتوں میں کڑوی سچّائی تھی جسے میں جھٹلا نہیں سکتا تھا۔

''آپ کو یہ بات سال پہلے کرنی چاہئے تھی جب آپ کی بہو کو نوکری مل رہی تھی اور اُس کے مرحوم شوہر کا پیسہ بھی۔ اس وقت آپ کیوں خاموش رہیں؟''

''میں اِس وقت بھی آپ کے پاس فریاد لے کر نہ آتی اگر ہمارے سر پر چھت سلامت رہتی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اُس وقت آپ کی رائے کو کوئی خاص اہمیت نہیں

دی۔ کیا مجھے اب نوکری مل سکتی ہے؟ میں ہر طرح کا کام کرنے کو تیار ہوں۔ بس یہ چھت ہم سے نہ چھینی جائے۔''

''آپ کی عمر میں سرکاری نوکری ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ میں یہ کوشش کرسکتا ہوں کہ اگر کسی سکیم کے تحت آپ کی بیٹی کو نوکری مل جائے۔ پھر بھی مکان تو آپ کو خالی کرنا ہی ہوگا۔ وہ آپ کو نہیں مل سکتا۔''

''کچھ تو کیجئے شرما صاحب! میں بہت امید لے کر آئی ہوں آپ کے پاس۔''

''میرے بس میں ہوتا تو میں آپ کی ضرور مدد کرتا۔ ہاں! اگر آپ اپنی بہو سے بات کرلیں اور وہ راضی ہوجائے تو میں کوئی چھوٹا مکان اُس کے نام پر الاٹ کروا دوں گا۔''

''میں اُس سے کس حق سے بات کرسکتی ہوں۔ وہ میری کیا سُنے گی۔ اُس نے تو ایک بار بھی ہم ماں بیٹی کا نہیں سوچا۔ سارا پیسہ بھی رکھ لیا، نوکری بھی لے لی اور اب۔۔۔''
بات کرتے کرتے اُس کی آواز گلے میں ہی دب گئی۔

''اب! اب کیا؟''

''اس نے کچھ نہیں گنوایا شرما صاحب! اُسے نیا پتی بھی مل گیا ہے۔ بس مجھے ہی بیٹا نہیں ملا۔''

بلراج ٹھاکر دوسروں کو انصاف دلاتا رہا اور آج اُسی کی بیوہ کے ساتھ ناانصافی ہوگئی۔ مجھے اُس کے دُکھ کا شدّت سے احساس تھا مگر میں تو خود بے بس، لاچار اور مجبور تھا۔ قاعدے قانون نے میرے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ کاش! میں ایسے قانون بدل سکتا۔

☆☆

ایک خواہش انیک سوال

میں نے جب دل کی بات مان کر عقل کو پیچھے دھکیل دیا اُس کی آواز ان سنی کر دی جو مجھے بار بار میری عمر اور رتبے کا احساس دلا رہی تھی مگر دل تھا کہ اس عمر میں بھی ادھوری خواہش پوری کرنے کے موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ اُس وقت میں نے انجام کی پرواہ نہیں کی۔ اُسے دیکھتے ہی میرا دل پھر سے ویسے ہی دھڑکنے لگا تھا جیسے جوانی میں دھڑکتا تھا۔

میں اپنے دوست کو چھوڑ کر ائیر پورٹ سے نکل رہا تھا کہ میری نظر سامنے کھڑی اُس عورت پر ٹک گئی جس کا چہرہ پچھلے پچیس سالوں سے میرے دل میں بسا تھا۔ اس تصویر اور سامنے کھڑی اِس عورت میں عمر کا فرق تو آ گیا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ میں اُسے پہچان نہ پاتا۔ اُس چہرے کو میں لاکھوں کی بھیڑ میں بھی پہچان لیتا۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی میں نے اُس کی یادوں کو دل کے کسی کونے میں زندہ رکھا تھا وہ میرا پہلا پیار تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹھک گئی غور سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو پھر آنکھوں میں ایک دم چمک اُبھر آئی اور چہرا کھل اُٹھا۔ لپک کر وہ میری طرف بڑھی۔

''تم کرن ہونا؟''

''ابھی تک تو کرن ہی ہوں کل کا پتا نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملانے کو آگے بڑھایا تو وہ تپاک سے گلے لگ گئی۔ وہ اس گرم جوشی سے ملی جیسے دو پرانے دوست

ایک مدت بعد ملتے ہیں۔ اور میں اس لمحے کی سحر آگیں فضا میں کھو گیا۔ میرا پیار پہلی بار مجھے گلے مل رہا تھا۔ دل کی یہ آرزو تھی کہ وقت یہی تھم جائے مگر وقت کہاں رُکتا ہے۔ اگلے ہی پل وہ مجھ سے الگ ہو کر مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''جوانی میں تو اتنے ہینڈسم نہیں تھے؟''

''تمہیں کس نے کہہ دیا کہ میں جوان نہیں ہوں۔ میں تو ابھی بھی جوان ہوں۔ یہ بات اور ہے کہ بالوں میں تھوڑی چاندنی جھلکنے لگی ہے۔ دل تو ابھی بھی بیس سے پار نہیں ہوا''۔

''انٹرسٹنگ! ویری انٹرسٹنگ(Interesting Very Interesting!)''

''اکیلی آئی ہو؟''

''بالکل اکیلی۔ میاں جی کے پاس وقت نہیں ہے۔ وہ آج کل فرانس گئے ہوئے ہیں۔ ایک بیٹی ہے وہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہے۔ تم سناؤ کہاں ہوتے ہو آج کل؟''

''میں تو اسی شہر کا باشندہ ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ کوئی لینے آنے والا ہے تمہیں؟''

''نہیں۔ میں سرپرائیز دینے والی ہوں سب کو۔ اچانک اپنے سامنے دیکھ کر جو ماں بابا کی آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے بس وہ دیر تک یاد رہتی ہے پھر''۔

''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں چھوڑ دیتا ہوں تمہیں''۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔ اسی بہانے تمہارے ساتھ باتیں کرنے کا موقع بھی مل جائے گا''۔

''مجھ سے باتیں کرنے کا موقعہ یا بہانہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں۔''

''شاعری بھی کرنے لگے ہو؟ کچھ اپنے کچھ دوستوں کے بارے میں بتاؤ۔ مجھے تو مدت ہو گئی کبھی کسی سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔''

راستے بھر کالج کے دوستوں اور اُن دنوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ میرے بارے میں بھی پوری معلومات حاصل کر لی۔ پچیس سالوں کا سفر ہم نے پچیس منٹ کے راستے میں

طے کرلیا۔ باتوں باتوں میں کب اُس کا گھر آ گیا پتا ہی نہ چلا۔ اُس نے اندر آنے کو کہا تو میں ٹال گیا۔

''آج نہیں پھر کسی دن آؤں گا۔''

''صرف ایک ہفتے ہی ہوں میں یہاں۔ اگلے سنیچر کو میں واپس چلی جاؤں گی۔ ہو سکے تو وقت نکال لینا۔ سچ کہوں تو تم سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ایسے لگا گزرا زمانہ لوٹ آیا ہے۔''

''مجھے بھی بہت اچھا لگا۔ میں خود تم سے ملنا چاہوں گا۔ تمہارا سیل نمبر میں نے فیڈ کرلیا ہے۔ جلد ہی فون پر بات ہوتی ہے۔''

اتنا کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا مگر ذہن کالج کے دنوں میں کھو گیا۔ رچنا میرے ساتھ کالج میں پڑھا کرتی تھی۔ آٹھ لڑکے لڑکیوں کا گروپ تھا جس میں وہ بھی شامل تھی۔ سب کو اس بات کا علم تھا کہ میں اس کا شیدائی ہوں۔ اسے دیکھ کر میں سب کچھ بھول سا جاتا ہوں۔ اسے اس بات کا پتا تھا مگر اس نے کبھی ہوا نہیں لگنے دی۔ وہ میرا پہلا پیار تھی۔ اسے لے کر اس دل نے بہت سے خواب سجا رکھے تھے ابھی میں اپنی حسرتوں، اپنی خواہشات کا، اپنے جذبات کا اظہار بھی نہ کر پایا تھا کہ معلوم ہوا کہ وہ تو جلد ہی اپنی نئی دنیا بسانے جا رہی ہے۔ دل کی بات دل میں ہی گھُٹ کر رہ گئی۔ میں سپنے سجاتا ہی رہ گیا اور اس نے کسی اور کی دنیا بسا دی۔ بمبئی کے کھاتے پیتے گھر میں اس کا رشتہ طے ہوا تھا۔ اسی خوشی میں اس نے دوستوں کو بڑی شاندار پارٹی بھی دی تھی جس میں میں شامل نہیں ہوا۔ اس نے گلہ بھی کیا مگر میں خاموش رہا۔ اس دن کے بعد میں اس سے کترانے لگا تھا۔ پھر امتحانوں کے ختم ہوتے ہی اس کی شادی ہوگئی اور اس کے بعد میری اس سے کوئی ملاقات نہ ہوسکی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس کی ہر خبر مجھے ملتی رہتی۔ زندگی اپنی رفتار سے بڑھتی گئی اور میں بھی زندگی کے بہاؤ میں بہتا چلا گیا۔

مصروفیت کے باوجود اس کے فون کا انتظار دل میں رہا۔ دفتر کے کام سے شہر سے

باہر جانے والا تھا وہ بھی رد کر دیا۔ منگل وار صبح ہی اُس کا فون آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ اُسے کچھ خریداری کرنی ہے اور پھر یہ طے پایا کہ ہوٹل تاج میں ہم دونوں لنچ ایک ساتھ کریں گے۔ ٹھیک دو بجے میں تاج کی "Lobby" میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ انتظار کے پل کاٹے نہیں کٹ رہے تھے۔ مجھے خود پر تعجب تھا کہ اس عمر میں بھی دل کی دھڑکنے نہیں بدلیں اس کے ارمان نہیں بدلے۔ مسکراہٹ چہرے پر سجائے اور ہاتھوں میں شاپنگ کے لفافے لئے بڑھی چلی آ رہی تھی اور میں اُس کی دل فریب مسکراہٹ میں کھو گیا۔ لنچ کے دوران پرانے قصوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دوستوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ باتوں باتوں میں پتا ہی نہ چلا کہ کیسے میرے دل کی بات زباں تک آ گئی۔

''تمہاری شادی کا سن کر بہت دھکا لگا تھا مجھے۔ تم جانتی تھیں کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔''

''جانتی تو تھی پر کر کچھ نہیں سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری شادی پاپا کے دست کے بیٹے سے ہی ہونی ہے۔ تمہیں بتا کر کیا کرتی کہ تم مجھے پسند ہو۔''

اُس کی بات سن کر میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ لڑکیوں کا ہاضمہ اتنا مضبوط ہوتا ہے؟ کوئی بھی راز چاہے تو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں اس کی بھنک تک نہیں پڑنے دیتیں۔

''اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ اشوک نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا ہے کبھی کسی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ پیسے کی کوئی کمی نہیں کبھی کسی بات پر روک ٹوک نہیں۔ ایک بیٹی ہے جو ہم دونوں کو بہت پیار کرتی ہے۔ ہماری جان ہے۔ زندگی کا ہر سکھ میسر ہے۔ زندگی سے کوئی شکوہ کوئی شکایت نہیں۔''

''اس معاملے میں بدنصیب میں بھی نہیں ہوں۔ ساوی دل و جان سے چاہتی ہے۔ دونوں بیٹے پڑھ رہے ہیں۔ نوکری اچھی ہے سب کچھ تو ہے پھر بھی تھوڑی سی کسک ہے جو گاہے بگاہے پریشان کر دیتی ہے۔''

''وہ کیا؟''

’’اپنے پہلے پیار کو چاہتے ہوئے بھی بھلا نہ پایا۔ بہت سے سپنے دیکھے تھے جوانی میں جو آج بھی آنکھوں میں تیرتے ہیں۔‘‘

’’مثلاً؟‘‘

’’اپنے پیار کے ساتھ زندگی گزارنے کے۔ گھر بسانے کے۔‘‘

’’وہ تو اس جنم میں ممکن نہیں۔ ہاں زندگی تو نہیں ایک دن اس زندگی سے چرا تو سکتے ہیں۔‘‘ اس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

مجھے اُس کی بات پر حیرانگی بھی ہوئی اور دل میں خوشی بھی محسوس ہوئی۔ میں اپنی جوانی کے ادھورے ارمان اس عمر میں ایک دن میں پورے کر سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہی میری آنکھیں چمک اٹھیں۔

’’اگر میں اس وقت ہاں کر دیتی تو پورا دن تم میرے ساتھ کیسے بتاتے؟‘‘ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

’’میں تمہیں اپنی موٹر سائیکل پر شملہ لے جاتا۔ ان حسین خوبصورت پہاڑیوں میں ہاتھوں میں ہاتھ تھامے گھومتے خوب موج مستی کرتے پیار کی باتیں کرتے، جینے مرنے کی قسمیں کھاتے اور شام کو واپس لوٹ آتے۔‘‘

مجھے خود اپنے جذبات بڑے معصوم لگے۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

’’اب اس عمر میں میں موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھوں گی اور شملہ بھی نہیں جاؤں گی۔ گاڑی میں لے چلو اور وہ بھی کسولی تک ہی۔ کسولی کی پہاڑیوں میں گھوم لیں گے۔ وہ بھی اتنی، ہی دلکش اور خوبصورت ہیں‘‘۔

’’ٹھیک ہے تو کس دن ڈیٹ پر چل رہی ہو؟‘‘

’’میں اشوک سے پوچھ لیتی ہوں تم ساوی سے پوچھ لو پھر چلتے ہیں‘‘۔

وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

’’پھر تو یہ دن اگلے ہی جنم میں آئے گا۔‘‘ میں نے مایوس ہو کر کہا۔

’’پرسو چلیں؟ سنیچر کو تو میری واپسی ہے۔‘‘

’’پرسو یعنی گُر بار۔ صبح گیارہ بجے کہاں ہوگی؟ گھر لینے آؤں؟‘‘

’’پرانے دن واپس لانے کی کوشش کر رہے ہو تو کالج کے باہر ہی ملوں گی۔

’’ٹھیک۔ جمعرات صبح گیارہ بجے‘‘

’’ساوی کو ساتھ لے چلتے ہیں۔ میں اُس سے کبھی ملی نہیں۔ اسی بہانے ملاقات بھی ہو جائے گی۔‘‘

مجھے چڑانے میں اُسے مزا آ رہا تھا۔

’’اگلی بار ملواؤں گا۔ ڈیٹ پر ہم دونوں ہی جائیں گے‘‘۔

میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا اور پھر مقرر دن اور وقت پر ملنے کا وعدہ کر کے ہم دونوں اپنے اپنے راستے ہو لئے۔

یہ دو دن میں نے بہت مشکل سے کاٹے۔ میری بے چینی ساوی سے چھپی نہ رہ سکی۔

’’آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟‘‘

’’کیوں کیا ہوا میری طبیعت کو؟‘‘

’’کچھ پریشانی ہے کیا؟‘‘

’’ایسی کوئی بات نہیں۔ دفتر میں کچھ کام زیادہ ہے اسی سلسلے میں مجھے کل شاید سولن بھی جانا پڑے۔ تم فکر مت کرو یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔‘‘ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میں جانتا تھا میرے اس جواب سے اسے تسلی نہیں ہونے والی۔ میرا چہرہ دیکھ کر وہ سب بھانپ لیتی تھی۔ زندگی کے ہر موڑ پر ہر مشکل میں اس نے میرا ساتھ دیا ہے۔ بچوں کی پرورش اچھی طرح سے ہو سکے، اس نے بینک کی ملازمت چھوڑ دی۔ اپنا (Career) اپنے گھر پر قربان کر دیا۔ اپنی ایک بھولی بسری چھوٹی سی خواہش کو پورا کرنے کے لئے میں اپنی بیوی سے جھوٹ بول رہا تھا۔ دوسرے ہی پل میری آرزوؤں نے میرے ضمیر کی

آواز کو دبا دیا۔

جمعرات گیارہ بجنے سے پندرہ منٹ پہلے ہی میں گاڑی لے کر کالج کے باہر کھڑا تھا۔ دفتر سے چھٹی لے لی تھی اور ساوی کو بہانہ بنا دیا تھا کہ سولن دفتر کے کام سے جا رہا ہوں شام تک لوٹ آؤں گا۔ ٹھیک گیارہ بجے رچنا میرے سامنے تھے۔ کالج کے ماحول اور اپنے ارد گرد نوجوان لڑکے لڑکیوں کو دیکھ کر اپنی عمر کا احساس نہیں رہا۔ ہم دونوں اس طرح خوش تھے کہ کالج کی پکنک پر جا رہے ہوں۔ گاڑی اپنی رفتار سے کسولی کی طرف بڑھ رہی تھی اور ہم دونوں اپنی موجودہ زندگی کو بھول کر ماضی میں پہنچ چکے تھے۔ اس عمر کو بیتے ہوئے لمحوں میں جینا چاہتے تھے صرف ایک دن اسی زندگی سے چوری کر کے ادھوری خواہشوں، ادھورے ارمان کے نام کر دی تھی۔ کسولی کی فضا میں عجیب سا جادو تھا۔ گھنے دیودار کے پیڑ، چاروں طرف ہریالی، ہوا کا سنگیت اور اُس پر ہلکی ہلکی بوچھار، کہیں کہیں بادلوں کا دھواں جیسے بادل زمین پر اتر آئے ہوں۔ اک دوسرے کے ساتھ کا خمار کچھ موسم اور کچھ ان حسین وادیوں کا جادو جس نے ان لمحوں کو یادگار بنا دیا۔ ہاتھوں میں ہاتھ پکڑے ان گھنے درختوں کے بیچ و بیچ کبھی خاموش تو کبھی باتیں کرتے ہنستے مسکراتے ٹہلتے رہے۔ اک دوسرے کے دل کے تاروں کو چھیڑتے جسموں کی لذتوں سے کوسوں دور اپنی اپنی حدوں میں قید پھر بھی رشتوں کی ڈور سے آزاد۔ اک دوسرے کی صحبت میں وقت کیسے پنکھ لگا کر اڑ گیا پتا ہی نہ چلا۔ سورج ڈھلنے لگا تو گھنے درختوں میں شام کے سائے بڑھنے لگے۔ چہچہاتے پرندوں کو گھر کی اور اڑان بھرتے دیکھ ہمیں بھی اپنے آشیانے یاد آنے لگے۔ خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں لوٹنے کا وقت آ گیا۔ زندگی میں یہ وہ سنہرا دن تھا جو کبھی پلٹ کر نہیں آنے والا تھا۔ اب وہ صرف یادوں کا اک حصہ بن کر دل و دماغ پر اپنی امٹ چھاپ چھوڑ گیا تھا۔ پھر کبھی دوبارہ نہ ملنے کا اک دوسرے سے وعدہ کر کے ہم واپسی کے لئے روانہ ہو پڑے۔ ہم نے کب سوچا تھا کہ اس یادگار سنہرے دن کا اختتام اس طرح ہو گا۔ شام کے سائے بڑھ رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے راستہ بھی دُھندلا سا تھا۔ ملن کی خماری، بچھڑنے کا غم سب تاثرات

ذہن پر اس طرح حاوی تھے کہ سامنے سے آتی ٹرک کی تیز روشنی نے آنکھیں چوندھیا دی۔ سڑک پر پھسلن کی وجہ سے میرے سٹیرنگ (Steering) کا بیلنس خراب ہو گیا۔ زوردار ٹکر کی آواز اور رچنا کی دردناک چیخ پہاڑوں میں گونج گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ ہوش نہیں۔ آنکھیں کھلیں تو خود کو اسپتال کے بستر پر پایا۔ میں نہیں جانتا میں کب اور کیسے یہاں لایا گیا۔ درد سے جسم کا رُواں رُواں ٹوٹ رہا ہے۔ خود کی حالت سے بے خبر رچنا کے انجام سے انجان میں صرف اپنے ارد گرد کھڑے لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر ساوی، میرے دونوں بیٹے چند ڈاکٹر اور نرسیں میرے آس پاس کھڑے تھے۔ ساوی کو دیکھ کر میرے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ایک ہلچل سی شروع ہوگئی۔ کمرے میں دو پولیس والے بھی داخل ہوئے تو سارا واقعہ میری آنکھوں کے آگے گھوم گیا۔ اب میں نے جان بوجھ کر آنکھیں موند لی۔ ایک چھوٹی سی خواہش نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا بس سوالوں کے بھنور میں پھنسا دیا۔

خواب سے حقیقت تک

اسے اندھیرے سے نفرت تھی۔ تنہائی سے اسے خوف آتا تھا اور ویران سنسان جگہ سے وہ دور بھاگتا تھا۔ اس کی دنیا میں ان سب کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس نے تو بھرپور زندگی کے خواب دیکھے تھے جس میں قہقہے، ہنسی، شرارت اور مستی بھری ہو۔ ایک ایسا گھر جدھر رونق اور رشتوں کی ریل پیل بستی ہو۔ اسے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کی عادت تھی۔ بچپن میں اس کے خوابوں کا گھر ایسا تھا جہاں باپ کی ڈانٹ، ماں کا دلار، دادا کا رعب، دادی کا لاڈ اور بہن بھائیوں کی شرارتیں ہوتی۔ جب کبھی کوئی آشرم میں بچہ پسند کرنے آتا تو روشن للچائی آنکھوں سے اپنی باری کا انتظار کرتا اور جب اس کا کوئی اور ساتھی اپنے لئے ماں باپ کے ساتھ نئے گھر میں چلے جاتا تو اس کا معصوم دل ٹوٹ جاتا۔ آشرم کی سرد دیواریں اسے ڈرانے لگتی۔ ماں کی نرم گرم گود کی یاد ستانے لگتی جس کا احساس بھی وقت کے ساتھ مدھم پڑ چکا تھا۔ اسے ماں باپ کی دھندلی سی شکل یاد تھی۔ اسے دھندلا سا یاد تھا کہ اس کے چاچا اسے اپنے ساتھ ہری دوار لے گئے تھے وہاں اس کے سر کے بال منڈوا دئے گئے تھے اور اس کے ننھے ننھے ہاتھوں نے مشین کی طرح بنا سمجھے بنا جانے پوجا کی رسم نبھائی تھی۔ ایک سڑک حادثے نے اسے یتیم کر دیا تھا اور پھر جب وہ گھر واپس لوٹا تو وہ گھر اس کا نہیں رہا تھا۔ چاچی سارا دن اسے ڈانتی رہتی اور اس کے مرحوم والدین کو کوستی نہ تھکتی۔ ایک روز بیوی اور حالات سے ہار کر چاچا اسے یتیم خانے میں چھوڑ گئے تھے۔ پھر انہوں نے کبھی

اسے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ آشرم کی سرد دیواریں ہی اس کا رین بسیرا بن گیا اور اس کے ساتھی اس کا پریوار۔ جوانی میں قدم رکھا تو اس کے خوابوں کی تصویر بھی بدل گئی۔ اس کے خوابوں کے گھر میں اب نشا کا حکم چلتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے دو تین بچوں سے گھر میں چہل پہل ہے۔ بچے اس کے ارد گرد گھوم رہے ہیں کبھی وہ انہیں لاڈ کر رہی ہے تو کبھی ڈانٹ کر ان کی شکایت اس سے کر رہی ہے بچے ہنستے جاتے ہیں اور وہ غصے سے جھلا اٹھتی ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ مسکرا دیتا ہے۔ نشا اور وہ بچپن سے ایک ساتھ اس آشرم میں پلے بڑھے ہیں۔ دونوں کا دکھ اور خوشیاں یکساں ہیں۔ ایک ساتھ روئے ہیں تو ایک ساتھ ہنسے بھی ہیں۔ ایک دوسرے کو سہارا دیتے دیتے کب دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے انہیں پتا ہی نہ چلا۔ بارہویں کلاس پاس کی تو اسے آشرم کو الوداع کہنا پڑا۔ آشرم والوں کی مدد سے اسے ایک پرائیویٹ نوکری بھی مل گئی اور شام کے کالج میں داخلہ بھی۔ پیئنگ گیسٹ بن کر وہ نوکری اور پڑھائی مکمل کرنے لگا۔ نشا کو آشرم میں ہی بچوں کو پڑھانے کا کام مل گیا اور ساتھ میں آگے کی تعلیم بھی اس نے جاری رکھی۔ چھٹی کا دن وہ آشرم میں نشا اور ساتھیوں کے ساتھ ہی گزارتا۔ دو بے گھر اناتھ اپنا آشیانہ، اپنا پریوار بنانے کے خواب ایک ساتھ مل کر بننے لگے۔ سرکاری نوکری ملی تو اس نے ایک چھوٹا سا مکان بھی کرائے پر لے لیا اور آشرم والوں نے اُس مکان کو گھر بنانے کے لئے دونوں کی شادی رچا دی۔ بہت ہی سادہ طریقے سے پورے رسم ورواج کے ساتھ وہ دو سے ایک ہو گئے۔

''اپنے گھر'' کے جذبے سے دونوں نا آشنا تھے۔ اپنا گھر کیا ہوتا ہے انہیں اب معلوم ہوا۔ دونوں نے مل کر اس گھر کو پیار اور ارمانوں سے سجایا۔ کھلی آنکھوں سے دیکھے سپنے پورے ہونے لگے۔ چھوٹا سا گھر پیار کی بوچھاڑ اور خوشیوں کی برسات سے شرابور ہوا تھا۔ خوشی ان کے چہروں سے نور بن کر ٹپکنے لگی۔ پیار میں ڈوبا انسان کس قدر خوبصورت لگنے لگتا ہے یہ انہیں اب احساس ہوا۔ ہر دن عید اور ہر رات دیوالی کی طرح بسر ہونے لگی اماوس کے بعد والے چاند کی طرح ان کا پیار بڑھنے لگا۔ دوستوں میں چرچا ہونے لگی۔ کچھ

خوش ہوتے تو کچھ دل جلے حسد کے مارے جل کر رہ جاتے۔ شادی کے بعد نشا کا پہلا کرواچوتھ تھا۔ اپنے پتی کی لمبی عمر کے لئے اس نے بھی برت رکھا تھا۔ صبح جب وہ تاروں کی چھاؤں میں سرگی کھانے کو اٹھی تو وہ بھی ساتھ اٹھ بیٹھا اور اس نے نشا کو یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ وہ بھی برت رکھے گا اس کی لمبی عمر کے لئے۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو بیوی اپنے شوہر کی لمبی عمر کے لئے رکھتی ہے۔ آپ نہیں رکھ سکتے۔''

''ارے کہاں لکھا ہے کہ پتی اپنی پتنی کے لئے برت نہیں رکھ سکتا۔ مل کر ایک دوسرے کی لمبی عمر کی دعا کرتے ہیں۔ تمہارے بغیر مجھے لمبی عمر نہیں چاہیے۔''

''اتنا پیار اچھا نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے ڈبڈبا آئی تھی۔ خوشیوں نے ایک بار پھر دستک دی جب نشا نے بتایا کہ وہ دو سے تین ہونے والے ہیں۔ یہ خبر ملتے ہی وہ جھوم اٹھا۔ اسے اپنا گھر آنگن بچوں کی کلکاریوں سے گونجتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے پھر سے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے شروع کر دئے۔ ایک شام وہ دفتر سے گھر جلدی لوٹ آیا اور اسے بازار چلنے کو اصرار کرنے لگا۔

''کیا بات ہے بہت خوش نظر آ رہے ہو۔ کوئی خاص بات؟''

''آج مجھے ایک رُکی ہوئی رقم ملی ہے سوچتا ہوں تمہیں تھوڑی سی خریداری کروادوں۔''

''مگر مجھے ابھی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ کرواچوتھ پر تو تم نے نئی ساڑھی لے کر دی ہے۔''

''چلو تو۔ بچے کے لئے کچھ لے لینا۔''

''ابھی سے کیوں خریدنا۔ ابھی بہت وقت پڑا ہے۔''

''تھوڑا تھوڑا کر کے خریدلوگی تو مشکل نہیں ہوگی۔''

''تم اتنے اتاولے کیوں ہو رہے ہو صبر سے کام لو۔ مجھے تو لگتا ہے تم اپنے بچے میں اتنا کھو جاؤ گے کہ میرا پتّا ہی کٹ جائے گا۔'' اس نے جان بوجھ کر چھیڑتے ہوئے کہا۔

''پاگل لڑکی یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔ تم تو میری زندگی ہو۔ میرا جینا مرنا تو سب تمہارے ساتھ ہے۔ وہ تمہارا انش ہوگا اس لئے مجھے اس کا بے صبری سے انتظار ہے۔ آج یہ کہہ دیا آئندہ کبھی مت کہنا۔ نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

اور یہ انتظار لمبا ہوتا چلا گیا۔ اس رات اچانک خوشیوں نے اس گھر سے ہمیشہ کے لئے منہ پھیر لیا۔ سیلاب ان کی خوشیوں کو بہا کر لے گیا۔ برسات کا موسم تھا۔ صبح سے ہی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ شام ہوتے ہوتے سڑکوں پر پانی جمع ہو گیا۔ پانی کے بہاؤ سے کئی درخت ٹوٹ کر گر گئے۔ ٹریفک جام ہوا تو آمدورفت رک گیا۔ سڑکوں پر کھڑا پانی گھروں کے اندر گھسنے لگا۔ نشا اپنی صحت کی پرواہ کئے بغیر بن بلائے سیلاب سے گھر کے سامان کو بچانے کی جدوجہد کرنے لگی۔ تنکا تنکا کر کے آشیانہ بنایا تھا اپنی آنکھوں کے سامنے اسے کیسے برباد ہوتا دیکھ سکتی تھی۔ اچانک اس ک پیٹ میں تیکھا درد اٹھا۔ سب کام چھوڑ کر وہ وہیں بیٹھ گئی۔ مگر درد تھا کہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ پہلے وہ کراہی، پھر چیخی پھر چلائی مگر بارش کے شور میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔ اس نے ایک بار پھر ہمت جٹائی اور فون تک پہنچ گئی مگر برسات نے اسے بھی نہیں بخشا تھا وہ بھی ڈیڈ پڑا تھا۔

ادھر موسم کے تھپیڑے اور سڑک پر تباہی کی مار سہتے سہتے نشا کی فکر میں گھلا گھر پہنچا تو فون کے پاس ہی نشا بے سدھ پڑی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ درد کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر نمایاں تھیں۔ آنسوؤں کی لکیریں اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ تڑپ اٹھا۔ جب کوشش کرنے پر بھی وہ ہوش میں نہ آئی تو وہ بھاگا بھاگا پڑوسیوں کو بلا لایا۔ ان کی مدد سے جیسے تیسے ہو سکا اسے پاس والے میٹرنیٹی ہوم لے گئے مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ آپریشن ٹیبل پر ہی اس نے دم

توڑ دیا۔ روشن کے لئے یہ ایک زبردست صدمہ تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہی اس کی دنیا اجڑ گئی اور وہ کچھ نہ کرسکا۔ جس گھر میں بچے کی کلکاریاں اور آوازیں سنائی دیتی تھیں وہاں بالکل سناٹا چھا گیا۔ دوستوں نے مشکل سے اسے سنبھالا اور کریا کرم کی رسم پوری کروائی۔ جب نشا کے مردہ جسم کو چتا پر لٹا کر آگ کے حوالے کیا جانا تھا تو دوستوں کو اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ وہ جلتی چتا میں کود جاتا اگر وہ اسے مضبوطی سے پکڑ نہ لیتے۔ عورتوں کو تو بین کرتے، ستی ہوتے دنیا نے دیکھا مگر ایک مرد کو اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ اپنی زندگی کو وہ سپرد آتش کر کے گھر لوٹ آیا۔ گھر کے در و دیوار اسے کاٹنے کو دوڑ رہی تھیں وہ خاموشی سے رات کے اندھیرے میں اٹھا اور سوئے ہوئے دوستوں سے چھپتا چھپاتا شمشان گھاٹ پہنچ گیا۔ چتا کی راکھ ابھی گرم تھی۔ اس دن سے اس نے وہی ڈیرا جما لیا سارا سارا دن وہ شمشان گھاٹ میں بیٹھا رہتا۔ وہاں کا سناٹا اسے سکون دیتا۔ سائیں سائیں کرتی درختوں سے آتی ہوا کی آوازیں اس کے جلتے دل کو راحت دیتی۔ اکیلے ہی بیٹھا خود سے باتیں کرتا رہتا۔ اسے اپنا ہوش بالکل نہ رہا۔ نیم پاگلوں جیسی حالت ہوگئی اس کی۔ بزرگ، پنڈت (چارجی) جس کا گھر وہی شمشان گھاٹ کے کونے میں ہی تھا، اس کی حالت دیکھ کر اسے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی مگر سب ناکام رہا۔ دن میں کئی شو وہاں لائے جاتے لوگ روتے بلکتے آتے اور اپنے عزیزوں کو سپرد آتش کر کے وہاں سے چلے جاتے۔ وہ انہیں خالی خالی آنکھوں سے دیکھتا رہتا۔ پھر ایک شام بزرگ پنڈت اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

’’تم دیکھ رہے ہو نا کہ دنیا میں تم اکیلے نہیں ہو جس نے کسی اپنے کو کھویا ہے۔‘‘

وہ ویران نظروں سے اسے تکتا رہا۔

’’وہ کونے والی چتا جو جل رہی ہے ایک جوان آدمی کی ہے جو اپنے بزرگ ماں باپ کا اکلوتا سہارا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے اور ایک جوان بیوہ کو وہ بے سہارا کر گیا۔ اس کے آگے والی چتا ایک جوان عورت کی ہے جس کو اس کے سسرال والوں نے جہیز نہ ملنے پر

جلا دیا۔ وہ پیچھے والی چتا ایک بزرگ کی ہے جس کے مرنے پر بیٹے آپس میں جائیداد کی خاطر لڑ پڑے اور تین تین بیٹوں کے باپ کا انتم سنسکار اس کے دوست نے کیا۔ یہ دنیا تو آنی جانی ہے۔ تم خود کو اکیلا کیوں محسوس کرتے ہو۔ سبھی اکیلے آئے ہیں اور اکیلے ہی جائیں گے۔

یہاں پر تو بھرے پورے خاندان کے لوگ آتے ہیں اور انتم سنسکار کے بعد استھیاں تک اٹھانے کا ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ وہ استھیاں اپنی مکتی کا صرف انتظار ہی کرتی رہتی ہیں۔ تم کہتے ہو تمہیں اپنی بیوی سے پیار ہے۔ تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم نے بھی اپنی بیوی کی استھیوں کا احترام نہیں کیا۔ وہ بھی اپنی مکتی کا انتظار کر رہی ہیں۔ تمہارے ہوتے ہوئے وہ لاوارث نہیں ہوسکتی۔ اس ماتم سے باہر نکلو اور کرم کرو۔ اپنی زندگی کو کوئی معنی دو۔ اپنی بیوی کو مکتی دلاؤ۔‘‘ بزرگ تو اسے سمجھا کر وہاں سے چلا گیا مگر اس کے آخری الفاظ ’’تمہارے ہوتے وہ لاوارث نہیں ہوسکتی۔‘‘ اس کے ذہن پر ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگے۔ اس کے ہوتے نشا لاوارث نہیں ہوسکتی۔ اس کی مکتی کے لئے اسے یہاں سے باہر نکلنا ہی ہوگا۔

اگلے روز وہ ہری دوار کے لئے روانہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ صرف نشا کی استھیاں ہی نہیں بلکہ دس ایسے لوگوں کی استھیاں بھی تھیں جس کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ جنہیں کبھی اس نے دیکھا نہ جانا تھا۔ اس نے ان کا انتظار بھی ختم کر دیا تھا۔ پوجا پاٹھ کے بعد استھیاں گنگا میں بہا کر اسے ایسے لگا جیسے وہ سب اس کے اپنے تھے۔ اب وہ لاوارث نہیں انہیں مکتی دلا کر اس نے بھی سکون حاصل کیا ہے۔

اب اس نے پھر سے جینا سیکھ لیا ہے۔ اسے جینے کا مقصد مل گیا ہے اب وہ دفتر کام پر جاتا ہے۔ دل لگا کر کام کرتا ہے۔ سادہ زندگی بسر کرتا ہے اور جمع کئے ہوئے پیسوں سے وہ ہری دوار پہنچ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ لاوارث استھیاں ہوتی ہیں جو بزرگ پنڈت اس کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ ان دیکھے انجانے لوگوں سے ایک رشتہ قائم کر لیتا ہے۔

اب اسے ویرانے سے خوف نہیں آتا، اندھیروں سے وہ ڈرتا نہیں، سناٹوں سے اسے دہشت نہیں ہوتی۔ اب اس کی آنکھوں نے خواب دیکھنے چھوڑ دئے ہیں۔ زندگی کی حقیقت اب وہ جان چکا ہے۔

☆☆

ایک ہی رہ گزر

آج پھر اس کے گھر چولہا نہیں جلا تھا۔ پچھلے کئی دن تو اس کے بچے لوگوں کے رحم و کرم پر پل رہے تھے۔ دبلے، پتلے، سانولے، میلے کچیلے ادھ ننگے جسم، آنکھوں میں حیرانی اور پریشانی لیے ماں سے لپٹ لپٹ جا رہے تھے۔ پچھلے کئی روز سے اتنے لوگوں کو انہوں نے اپنی کھولی میں آتے دیکھا تھا کہ ان اجنبی چہروں میں وہ اپنے باپ کو تلاش کر رہے تھے جو پھر کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بدری ناتھ بجاج کے جوان بیٹے کی ہوا کے دوش پر بھاگتی لمبی گاڑی نے اسے اپنا شکار بنا لیا اور دو پل میں ہی مادھو بھوک، پیاس اور زندگی کے جنجال سے آزاد ہو گیا۔ جوان بیوی اور تین اور چار سال کے دو بیٹوں کو ایک اپاہج باپ کے سہارے چھوڑ گیا۔ دینو شروع سے اپاہج نہیں تھا۔ گاؤں اس نے مجبوری میں چھوڑا تھا۔ ساہوکار کا قرض اتنا تھا کہ جو ایک چھوٹا سا ٹکڑا زمین کا بچا تھا اس سے تو گھر والوں کے لیے اناج نہ نکلتا پھر گاؤں میں مزدوری بھی بہت کم ملتی تھی، اس لیے وہ زمین بیٹے کے حوالے کر کے خود گاؤں میں مزدوری کرنے چلا آیا۔ شہر آ کر اس نے سائیکل رکشہ چلا کر خون پسینہ ایک کر دیا۔ اتنا کما لیتا تھا کہ ساہوکار کے قرض کا بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا اور چار پیسے بیٹے کے کام بھی آ جاتے۔ دشواریوں سے کچھ راحت ملی تھی کہ ایک روز اس کی رکشہ کو بس نے ٹکر مار دی اور رکشہ چور چور ہو گئی۔ اس حادثے میں اس کی جان تو بچ گئی مگر ایک ٹانگ سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونا پڑا۔ مادھو کو گاؤں چھوڑ کر باپ کے پاس شہر

آنا پڑا اور پھر اپاہج باپ اور سارے گھر کی ذمہ داری، اس نے سنبھال لی۔ دینو کے ایک جان پہچان والے ٹھیکیدار نے اسے دہاڑی پر رکھ لیا۔ گرتی پڑتی زندگی پٹری پر آ ہی گئی تھی کہ اب یہ سانحہ پیش آ گیا۔ ٹھیکیدار نے مادھو کے پریوار کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دی تھی۔ وہ تو دو بول ہمدردی کے بھی کہنے نہیں آیا۔

یہ تو بستی کے لوگ تھے جو آ کر بچوں کو اور انہیں کھانا کھلا جاتے۔ سبھی ان جیسے ہی تھے تنگ دست۔ ننگے نہاتے کیا اور نچوڑتے کیا؟ دو تین روز کھانا کھلا کر وہ بھی پیچھے ہٹ گئے۔ اس سے زیادہ کی توقع کرنا بھی بے وقوفی تھی۔ اس شہر میں دوسرے صوبے سے جو بھی ملازمت کی تلاش میں آتا اسے اس بستی میں پناہ ملتی۔ یہ بستی غیر قانونی طریقے سے بسی ہوئی تھی۔ جس کی تعداد دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ چاہتے ہوئے بھی سرکار انہیں یہاں سے ہٹانے میں ناکامیاب تھی کیونکہ سیاسی پارٹیوں کے لیڈران ان کے سرپرست ہیں۔ ان کے لیے تو یہ بہت بڑا ووٹ بینک ہے۔ بستی کے لوگ ہی ایک دوسرے کے سگے سمبندھی اور رشتے دار ہیں کیونکہ روزی روٹی کے چکر میں سبھی رشتے تو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ بیٹے کی موت کے بعد اس بستی کا لیڈر کنج بہاری ہی دینو کا سب سے عزیز رشتہ دار بن گیا تھا۔

ورندر بجاج کی گاڑی کا حادثہ اس شہر کی سیاسی پارٹی کے جی کا جنجال بن گیا۔ مخالف پارٹی کو سنہرا موقع مل گیا تھا ان کے خلاف ایک اور مہم شروع کرنے کا۔ بدقسمتی سے مادھو اس بستی کا باشندہ تھا جس کا لیڈر کنج بہاری مخالف پارٹی کا کارندہ تھا۔ الیکشن سر پر تھے اور کنج بہاری نے اپنی پارٹی کے لیڈروں کے اشارے پر اسے ایک اہم مدعا بنا لیا تھا۔ بستی کے گیٹ پر ہی وہ بستی والوں کو جمع کر کے جلسہ کر رہا تھا۔

''بھائیو! ہم سب کو مل کر ان ظالموں کو منہ توڑ جواب دینا ہے، جس نے ہمارے بھائی مادھو کا خون کر دیا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کسی طرح بھی بچ نہ پائے۔ اسے اس کی کڑی سے کڑی سزا مل کر رہے گی۔ ہم سب ساتھ ہیں اس کا ثبوت زوردار نعرہ لگا کر دیں گے۔

''بدری ناتھ ہائے ہائے''

''ہائے ہائے ہائے''

''ہم سب......''

''ایک ہیں''

''گناہ گار کو......''

''پھانسی دو''

''ہمیں کیا چاہیے؟''

''ہمیں انصاف چاہیے''

دینو بھی اس جلسے میں سب سے آگے بیٹھا تھا۔ بدری ناتھ بجاج شہر کا نامی رئیس اور اس بار الیکشن میں ایک طاقت ور امیدوار تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ لے دے کر اس قصے کو ختم کر دیا جائے مگر مخالف پارٹی کے لیڈر اس قصے کو ختم ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔

کنج بہاری نے اسے یقین دلایا تھا کہ نہ صرف اسے انصاف ہی دلائے گا بلکہ اسے اچھا خاصا معاوضہ بھی ملے گا، جس سے اس کی آنے والی زندگی کی دشواریاں ختم ہو جائیں گی۔ اس غریب کو تو ایک سہارا چاہیے تھا اور پھر کنج بہاری سے زیادہ مضبوط سہارا اسے کہاں ملتا، وہ جیسے جیسے کہتا جاتا، وہ ویسے ہی کرتا جاتا۔

رات کو جب وہ گھر لوٹا تو دونوں بچے اس سے لپٹ گئے۔ چھوٹے والے نے گود میں بیٹھتے ہی کہا۔

''دادا کیا ہمارا باپو مر گیا؟''

''تم سے کس نے کہا؟''

''وہ مونچھوں والا آدمی آیا تھا نا وہ کہہ رہا تھا'' بڑے والے نے جواب دیا۔

اس نے بہو کی طرف دیکھا جو کھولی کے کونے میں سکڑی بیٹھی تھی۔ آدھا چہرہ پرانی پھٹی ہوئی دھوتی سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ چھوٹی سی کھولی دینو نے کرائے پر لے رکھی تھی اور جب مادھو گاؤں سے پورا پریوار لے کر شہر آ گیا تو وہ خود کھولی کے باہر سونے لگا تھا۔ کھولی

کے ایک کونے میں ہی کھانا پکانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ آج بھی وہ جگہ بالکل صاف تھی جس سے پتہ چل رہا تھا کہ چولہا نہیں جلا۔

''بہو کون آیا تھا ملنے؟''

''اسی بستی کا رہنے والا ہے، نام تو بتایا نہیں، کہہ کر گیا ہے کہ دوبارہ آؤں گا۔''

''بچوں نے کچھ کھایا؟'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''گھر میں کچھ بھی نہیں ہے پکانے کو۔''

''تم فکر مت کرو میں کرتا ہوں کچھ انتظام۔'' اتنا کہہ کر وہ ایک بار پھر کھولی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑے بہت پیسے جو کنج بہاری نے دیے تھے وہ ختم ہو چکے تھے۔ کل صبح کیس کی سنوائی تھی اور وہ اسے باقی کی رقم کل ہی دے گا۔ پھر بھی بچوں کے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے وہ کنج بہاری کے پاس پہنچ گیا۔ وہ یہ بخوبی جانتا تھا کہ کچھ لوگ اس پر اور اس کے گھر ہر آنے جانے والے پر نظر رکھ رہے ہیں تا کہ بجاج کے لوگ اس سے مل نہ لیں۔

کنج بہاری نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو اسے اپنے ساتھ اپنے گھر کے اندر لے گیا۔

''بیٹا مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔ بچوں نے کچھ کھایا نہیں۔''

اس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

اس نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اس کے آگے بڑھا دیا۔

''بس اتنے؟''

کل کیس کی سنوائی ہے۔ تمہیں جو کہا گیا ہے وہی کرنا۔ تمہارے بیان پر ہی سب منحصر کرتا ہے۔ بجاج کا بیٹا...... کسی طرح بھی بچنا نہیں چاہئے۔ اسے سزا ہو گئی تو باپ تو خود بخود ہی ہار جائے گا۔'' اس کی آنکھوں میں چمک دیکھ کر دینو کو بیٹے کی جدائی شدت سے تڑپا گئی۔ بجلی کی طرح اس کے ذہن میں ایک خیال کوندھا۔ اس کے بیان کے بعد اگر یہ لوگ

اپنے وعدے سے مکر گئے تو اس کے پریوار کا کیا ہوگا۔ حکومت میں آنے کے بعد یہ لوگ تو ان کی بولتی ہی بند کرا دیں گے اور اگر انہوں نے منہ کھولنے کی کوشش کی تو یہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ اسے بیوہ بہو اور یتیم بچوں کا مستقبل ڈگمگاتا ہوا محسوس ہوا۔

''بیٹا تم یہ سو کا نوٹ رکھ لو اور جو رقم تم نے مجھے صبح کچہری میں دینی ہے وہ آج ہی دے دو۔''

''کیا بات ہے چاچا ہم لوگوں پر بھروسہ نہیں کیا؟''

''نہیں یہ بات نہیں۔ بس رقم مل جائے تو تسلی ہو جائے گی۔ آج کچھ لوگ ادھر سے بھی آئے تھے۔''

''پھر؟''

''ضرورت انسان سے کچھ بھی کرا سکتی ہے۔''

''ہم یہ جنگ تمہیں انصاف دلانے کے لیے کر رہے ہیں۔ ورنہ تم اکیلے کیا کر سکتے تھے؟''

''میں جانتا ہوں میری حیثیت کیڑے مکوڑے سے زیادہ نہیں۔ وہ پیسے والے لوگ ہم جیسوں کو بڑی آسانی سے مسل سکتے ہیں۔''

''پھر بھی تم ہم سے اس طرح تقاضہ کر رہے ہو؟''

''جب دنیا میرے جوان بیٹے کی چتا پر اپنی روٹیاں سینک سکتی ہے تو مجھے اس کے اناتھ بچوں کے بارے میں سوچنے کا پورا حق ہے۔''

کنج بہاری تھوڑی دیر اس لنگڑے بوڑھے کو دیکھتا رہا۔ اسے تو اس نے کمزور، بے بس، لاچار سمجھا تھا، مگر یہ تو سیانہ بوڑھا نکلا۔ اس کی باتوں سے بغاوت کی بو کو اس نے بھانپ لیا۔ وہ اس وقت کسی قسم کا جوکھم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اگر بوڑھے کو بجاج کے کارندوں نے خرید لیا تو پارٹی والے اسے چھوڑیں گے نہیں۔ نہ مال ملے گا نہ ترقی۔ اس نے اپنا لہجہ بدل لیا اور اٹھ کر بیگ میں سے بیس ہزار نکال کر دے دیے۔

''یہ تم ابھی اپنے پاس رکھو باقی کے چالیس ہزار تمہیں کچہری میں مل جائیں گے۔''

''صرف ساٹھ ہزار۔'' اس نے نوٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

''کیا تم نے اتنی بڑی رقم کبھی دیکھی ہے چاچا؟''

''تم تو کہتے تھے لاکھوں ملیں گے۔ کم از کم ایک لاکھ تو مل جاتا۔''

''کچھ پیسے ان ساتھیوں کو بھی بانٹنے ہیں جو اپنی دہاڑی چھوڑ کر روز جلسوں میں اپنا پسینہ بہا رہے ہیں۔''

''اسے پارٹی دے گی یا وہ بھی اس معاوضے میں سے نکلے گا؟''

''تم تو حساب کتاب کے بڑے پکے نکلے چاچا۔ فکر مت کرو کل پیسے بڑھوا دوں گا۔ اب تم آرام سے گھر جاؤ اور صبح آٹھ بجے تیار رہنا۔ کوئی ہوشیاری نہیں چاہئے۔''

''تم بے فکر رہو مجھے تو بس آپ لوگوں کا ہی سہارا ہے۔''

نوٹ جیب میں آتے ہی اس کا لہجہ بھی بدل گیا۔

صبح آٹھ بجے آنے کا وعدہ کر کے وہ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ راستے میں اس نے ایک جگہ رک کر کھانے پینے کا سامان لیا، ایک دو لوگ مل گئے ان سے باتیں کرتا رہا اور پھر کچھ سوچتا ہوا کھولی کے اندر داخل ہو گیا۔ بچوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور سو گئے۔ دینو نے بہو کو پاس بلا کر چند باتیں کیں اور سونے کے لیے کھولی سے باہر چلا گیا۔

صبح آٹھ بجے سے پہلے ہی کنج بہاری اپنے آدمیوں کو لے کر دینو کی کھولی پر پہنچ چکا تھا۔ آج کچہری میں پہلی سنوائی تھی۔ دینو فریادی بھی تھا اور اہم گواہ بھی۔ کھولی کے باہر کسی کو نہ دیکھ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ تیز قدموں سے آگے بڑھا دروازہ کھٹکھٹایا، کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر اس نے ہلکے سے ہاتھ لگایا کہ دروازہ کھل گیا۔ اندر کوئی نہ تھا سامان ویسے ہی پڑا تھا۔ اس نے اپنے آدمی چاروں طرف پھیلا دیے۔

دینو میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ شہر چھوڑ کر بھاگ جائے۔ ہوسکتا ہے انہیں اغوا کر لیا

گیا ہو۔ وہ خود سے ہی باتیں کرتا ہوا کھولی سے باہر نکل آیا۔ اس کے آدمی شکاری کتوں کی طرح انہیں ڈھونڈھنے لگے۔

اس وقت تک وہ شہر سے اور ان لوگوں کی پہنچ سے بہت دور نکل چکے تھے۔ تیز رفتار گاڑی ہر گزرتے پل ان میں فاصلہ بڑھا رہی تھی۔

دونوں بچے ماں کے ارد گرد بیٹھے تھے اور بہو کے چہرے پر سکون دیکھ کر اسے بڑی راحت محسوس ہوئی اسے اپنے فیصلے پر کوئی پشیمانی نہیں ہوئی۔ کچھ کاغذات پر دستخط کے عوض میں اسے دو لاکھ نقد، بہو کے لیے فیکٹری میں ملازمت اور رہنے کو گھر مل رہا تھا تو وہ اسے کیسے ٹھکرا دیتا۔ وہ کون ہوتا ہے کسی کو سزا دلوانے والا۔ انصاف تو اوپر والا خود بخود کر دے گا۔ اسے بس اتنا اطمینان تھا کہ اب مادھو کے بچے بھوکے نہیں مریں گے۔ اب مادھو کی بیوی کو بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے جسم نہیں بیچنا پڑے گا۔ اب وہ آرام سے جی سکتا ہے اور چین سے مر بھی سکتا ہے۔

دو قدم کا فاصلہ

گوپال اس کا جگری دوست ہے اور وہ آج اس کے ساتھ ہری دوار اس کی ماں کی استھیاں گنگا میں وسرجت کرنے جا رہا ہے۔ کیسا اتفاق ہے کہ ایک طرف اس کے بچپن کی ساتھی نلنی کی شادی دھوم دھام سے ہو رہی ہے اور دوسری طرف اس کے جگری دوست کے گھر ماتم چھایا ہوا ہے۔ شادی کی خوشیاں چھوڑ کر وہ اس کے دکھ میں شریک ہوگیا۔ ویسے بھی وہ اس شادی میں شریک نہیں، ہونا چاہتا تھا۔ مگر وہاں نہ جانے کا اس کے پاس کوئی بہانہ بھی تو نہ تھا۔ بھگوان کی کچھ ایسی کرنی ہوگئی کہ وہ بچ گیا۔ نلنی کو اس نے بتایا تو وہ ناراض ہوگئی پہلے غصہ کیا پھر رو پڑی۔ اس نے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور اسے تسلی دینے لگا۔

''یار شادی ہی تو ہو رہی ہے رونے کی کیا بات ہے۔ کینیڈا کوئی بہت دور ہے۔ دیکھنا میں وہاں بھی تمہیں ملنے آجاؤں گا۔ میری دوست کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔''

پھر پیار سے اس کے گالوں پہ بہتے آنسو پونچھ دیئے۔

''اب مسکرا بھی دو''۔

''مسکراہٹ مفت میں نہیں ملتی اس کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ میرے پیچھے سات سمندر پار آنے کی ضرورت نہیں ہے بڑی مشکل سے تم سے پیچھا چھڑا کر

جا رہی ہوں اور تم وہاں بھی آنے کی سوچ رہے ہو۔ مجھے معاف ہی کرو''

آنسو پونچھتے ہوئے ناراضگی دکھاتے ہوئے بولی۔

''اب تم ہی بتاؤ ایسے موقع پر گوپال کا ساتھ چھوڑ دوں؟ تم کہو گی تو یہ بھی کردوں گا۔'' وہ سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں تمہیں روکوں گی نہیں۔ تم گوپال کے ساتھ ہری دوار جا رہے ہو تو میرا بھی ایک کام کر دینا پھر میں تمہیں معاف کر دوں گی۔''

''حکم میرے آقا'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''بس بہت ہوگیا یہ ناٹک۔ اب اٹھو'' اس نے شرارت سے، اس کے بال بکھیر دئے کیونکہ وہ یہ برداشت نہیں کرتا تھا کہ کوئی اس کے بالوں کو ہاتھ لگائے۔ اور نلنی کو جب بھی اسے چڑھانا ہوتا تھا تو وہ اس کے بالوں پر ہی حملہ کرتی تھی۔ وہ چلاتا رہ گیا اور وہ ہنستی ہوئی اپنے کمرے کی طرف لپکی۔ دو منٹ بعد وہ اس کے سامنے تھی۔ ایک بند لفافہ جو بہت ہی احتیاط سے بند کیا تھا اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔

''ایسے بھی گنگا میں وسرجت کر دینا'' تھوڑی دیر پہلے جو شرارت اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی اس کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ بند لفافہ اور اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر اس سے رہا نہیں گیا۔

''کیا ہے اس میں۔ بہت Suspecious لگ رہا ہے۔''

''کچھ ٹوٹے ہوئے۔ ارمان کچھ بکھرے ہوئے سپنے'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''میرے ہوتے تمہارے ارمان اور سپنے کیسے ٹوٹ گئے۔ کس نے یہ گستاخی کی مجھے بتاؤ ذرا!

''تم نہیں سمجھو گے عورت کے دل کی گہرائیوں کو۔ اس میں کیا کیا چھپا ہوتا ہے، تم جیسا اناڑی نہیں جان سکتا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے تمہارے دل میں کوئی آن بسا اور مجھے پتا بھی نہ چلا؟'' اس

نے حیرت سے نلنی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جانے دو اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ بس اتنا یاد رکھنا اس لفافے کو کھولنا نہیں اسے بند ہی ایسے گنگا میں بہا دینا''۔ اس نے آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

وہ آخری بار نلنی سے مل کر بھاری قدموں سے اس لفافے کو ساتھ لئے وہاں سے چلا آیا تھا جب تک وہ ہری دوار سے لوٹ کر واپس جائے گا وہ اپنے NRI خاوند کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ کر رخصت ہو چکی ہوگی۔ اچھا ہے وہ اسے جاتا ہوا نہیں دیکھ پائے گا۔ جدائی کے منظر سے، اسے ویسے بھی کوفت ہوتی ہے۔

نلنی اور اس کا گھر پاس پاس ہی تھا۔ بچپن دونوں کا ایک ساتھ شرارتیں کرتے گزرا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنا، ایک دوسرے سے روٹھ جانا اور پھر جلدی ہی مان بھی جانا، لوگوں کے گھروں سے کبھی پھول تو کبھی پھل توڑ کر بھاگ جانا، اس کا بار بار نلنی کو چڑھانا اور رلانا یہ سب منزلیں طے کر کے ہی وہ جوانی کی دہلیز تک ایک ساتھ پہنچے۔ ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے اس لئے اکثر ساتھ ہی آتے جاتے۔

کلی جب پھول بن کر کھلنے لگی تو اس کی خوشبو دور دور تک پھیلنے لگی۔ اکثر گلی کے لڑکے اسے آتے جاتے روک کر نلنی کے بارے میں پوچھا کرتے۔ طرح طرح کے سوال کرتے۔ انہیں رشک ہوتا کہ وہ اچھے دوست ہیں۔ لڑکوں کا اس کے بارے میں باتیں کرنا اسے ناگوار گزرتا۔ اسے بری نظروں سے بچانا اس کی حفاظت کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا۔ کئی بار اس کی لڑکوں سے تو تو میں میں ہو جاتی اور کئی بار تو نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی۔ اس کی نگہبانی کرتے کرتے وہ اس پر خود کا حق سمجھنے لگا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب نلنی نے اس کے دل و دماغ پر اپنا قبضہ جما لیا۔ وہ کب اس کے رگ و پے میں اترتی چلی گئی اسے معلوم ہی نہ ہو سکا۔

کالج میں داخلہ لیا تو نئے دوست اور نیا ماحول ملا مگر ان کی دوستی برقرار رہی۔ وہ

اسے دل و جان سے چاہنے لگا تھا۔ معلوم نہیں اس بات کا علم نلنی کو تھا یا نہیں۔ مگر وہ اسے اپنے جذبات سے آگاہ نہ کرا سکا۔ وہ اس کے ساتھ تھی اپنی ہر چھوٹی بڑی بات اس کے ساتھ بانٹتی تھی اس پر بھروسہ کرتی تھی، اس کے لئے اتنا ہی بہت تھا۔ جب کبھی وہ کسی لڑکے کے ساتھ اسے کینٹین یا لائبریری میں بیٹھا دیکھتا تو اس کا دل ڈرنے لگتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے دل کا حال بیان کر دے کہیں وہ اپنا دل کسی اور کو نہ دے بیٹھے مگر دل کی بات زبان تک آتے آتے رک جاتی۔ وہ ڈر جاتا کہ اگر اس نے اس کے پیار کو ٹھکرا دیا تو اس کی دوستی کا ساتھ بھی چھوٹ جائے گا جو اسے کسی بھی قیمت پر گوارا نہ تھا۔ کبھی کبھی اسے یوں بھی محسوس ہوا کہ وہ اسے غور سے دیکھ رہی ہے، اس کے بارے میں سوچ رہی ہے اور کبھی کبھی تو اس کا جنون اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا کہ وہ بھی اسے بے حد پیار کرتی ہے اس کے بنا رہ نہیں پائے گی۔ ایک دن اسے ٹٹولنے کے لئے اس نے ہمت جٹا ہی لی۔

''نلی مجھے لگتا ہے کمار تمہیں چاہنے لگا ہے''

''کون کمار؟ اچھا وہ کلا کار۔ اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔''

''اگر مجھے کوئی اس طرح سے چاہے تو میں اس کے بارے میں ضرور سوچوں گا''

''ایسے چاہنے والے تو بہت پھرتے ہیں بات تو یہ ہے کہ میں کسے چاہتی ہوں''

''کسے چاہتی ہو؟ مجھے بھی تو پتا چلے، تمہاری پسند''۔ وہ اس کے اور قریب کھسک کر بیٹھ گیا۔

''زیادہ پاس بیٹھنے سے میں بتا دوں گی؟''

''جب تم کسی کو چاہنے لگو گی تو مجھے خود بخود پتا چل جائے گا۔ تم مجھ سے کچھ چھپا نہ سکو گی''۔

''میں یہ بات نہیں مانتی''

''اچھا چلو یہ بتاؤ تمہاری پسند کیا ہے؟''

''لڑکا ہینڈسم ہونا چاہئے''۔

''وہ تو میں ہوں۔''

''سمجھدار ہونا چاہئے''

''وہ بھی میں ہوں۔''

''پیسے والا ہونا چاہئے۔''

''وہ میں نہیں ہوں''

''اسی لئے تمہارے بارے میں کبھی سوچا نہیں''

''بہت غلط کر رہی ہو۔ اتنا ہینڈسم اور سمجھدار لڑکا ہر دم تمہارے ساتھ رہتا ہے اور تم آنکھیں موند کر بیٹھی ہو۔''

''گھر کی مرغی دال برابر''

''پچھتاؤ گی''

''پچھتانا اور تمہارے لئے! اس جنم میں تو ممکن نہیں''

اس طرح کی نوک جھونک ان کی دوستی کی خصوصیت تھی۔

کئی بار تو اسی طرح بات کرتے کرتے وہ لڑائی پر اتر آتے اور دونوں میں جھگڑا بھی ہو جاتا مگر اگلے روز ہی وہ سب بھول کر ایک بار پھر سے ویسے ہی ہو جاتے۔

پڑھائی مکمل ہوئی تو روزگار تلاش کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ نوکری کی تلاش میں در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگا۔ ناکامی ہاتھ لگتی گئی اور مایوسی بڑھتی گئی۔ ادھر دور دور تک نوکری ملنے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے اُدھر نلنی نے اسے خبر دی کہ اس کے چاچا نے کینیڈا میں اس کے لئے ایک لڑکا پسند کیا ہے جو پندرہ دنوں کے لئے ہندوستان آرہا ہے اور اگر بات بن گئی تو چٹ منگنی پٹ بیاہ یہ سنتے ہی وہ تڑپ اٹھا۔ نوکری ہاتھ میں ہوتی تو ہمت کر کے دل کی بات کہہ ہی دیتا انجام کی پرواہ کئے بنا مگر ایک بے روزگار عاشق کس منہ سے دل کا حال بیان کرتا۔ دل کی بات دل میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

جس کا ڈر تھا وہی ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ لڑکا ایک بار نلنی کو دیکھ لے گا تو نا نہیں

کہہ پائے گا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے دل کی دنیا تباہ ہو گئی اور وہ اُف تک نہ کر سکا۔ اس کے لب سلے کے سلے رہ گئے۔ اس کی ہنسی کے پیچھے کتنے زخم چھپے ہیں، کسی کو بھنک تک نہ پڑنے دی۔ صرف گوپال ہی اس کے دل کی کیفیت سے واقف تھا مگر وہ بھی اپنے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔

گوپال نے اپنی ماں کی استھیاں بہت ہی احترام اور پیار سے اپنی گود میں رکھی تھیں۔ اسی طرح بہت ہی احتیاط سے نلنی کی امانت گنگا کی نذر کرنے کے لئے اس کے ہاتھوں میں ہی تھی۔ جس وقت سے وہ بند لفافہ اس کے ہاتھ آیا، اس کے دل میں ایک کانٹا سا اٹک رہا تھا۔ اس لفافے کو کھولنے کے لئے اس کی انگلیاں مچل رہی تھیں۔ وہ اس میں چھپے راز کو جاننے کو بے قرار تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ اسے کھول کر دیکھے مگر اس کے ضمیر نے اس کی اجازت نہیں دی۔ یہ تو نلنی کے بھروسے کا خون ہوگا، ایک دوست کے ساتھ غداری، وہ ضبط کر کے رہ گیا۔ انگاروں پر لوٹتا رہا مگر صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔

سارا دن سفر کرنے کے بعد وہ صبح سویرے ہری دوار پہنچ گئے۔ جاتے ہی ایک پنڈت کو تلاش کیا جو ان استھیوں کی پوجا کرا سکے۔ پنڈت نے پوجا شروع کی اور لال کپڑے میں بندھی استھیوں کو کھول دیا۔ پنڈت ان ہڈیوں کو گنگا جل سے صاف کر رہا تھا۔ منتر پڑھے جا رہے تھے اور گوپال سے پوجا کروا رہا تھا۔ وہ یہ سب پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ پھر پنڈت نے ہڈیوں میں سے ایک الگ سی ہڈی نکالی اور ان کے سامنے رکھ دی۔

''شاستروں میں کہا گیا ہے کہ انسان میں ایک ہڈی ایسی ہوتی ہے جسے آتما رام کہتے ہیں۔ یہ تمہاری ماں کی آتما کا روپ ہے۔ دیکھو کتنا صاف جیسے کوئی انسان پوجا کرنے بیٹھا ہو۔''

''یہ سب کیا ہے پنڈت جی؟''۔''اس نے تجسس سے پوچھا۔

''اگر کسی کا آتما رام ٹوٹا پھوٹا کھنڈت نکلے تو اس کا مطلب ہے اس انسان نے اچھے کرم نہیں کئے، اس کی آتما شد نہیں ہے اور اگر اس طرح کا بالکل صاف اور پوجا کی

آکرتی والا آتمارام آئے تو سمجھو وہ بڑی پوتر آتما تھی۔‘‘

وہ یہ سب سن کر خود کو نہ روک سکا۔ اگر انسان کی آتما کو استھیاں وسرجن سے پہلے جانا جا سکتا ہے تو اسے بھی اس بند لفافے کی آتما کو جاننے کا حق ہے۔ پیار اور جنگ میں سب جائز ہے۔

خود کو وہ تسلی دے کر گوپال کو وہی پوجا کرتا چھوڑ گنگا کے کنارے سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ دھڑکتے دل سے بند لفافہ کھول دیا۔ اس میں کچھ خط تھے جو وہ ایک ایک کر کے کھولتا گیا اور پڑھتا گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ آخری خط پڑھ کر وہ زار و قطار رونے لگا۔ راہ چلتے لوگ اس کی یہ حالت دیکھ کر سمجھے کہ ابھی ابھی اس کا کوئی اپنا مر گیا ہے۔ اس کا اس طرح رونا جائز بھی تھا۔ مر ہی تو گیا تھا وہ رشتہ جس کو جنم لینا تھا مگر اس کی مجبوریوں، بزدلیوں کی وجہ سے نہ لے سکا۔ خود کو وہ دنیا کا سب سے بدنصیب آدمی سمجھ رہا تھا۔ دو قدم کی دوری پر خوشیاں کھڑی تھیں جنہیں وہ تھام نہ سکا۔ سب کچھ اس کے نام کا تھا۔ پھر بھی اس کا دامن خالی تھا۔ اب وہ اس لفافے کا کیا کرے جس میں خط تو اس کے نام کے تھے مگر کبھی اس تک پہنچے ہی نہیں۔

☆☆

وہ صبح کبھی تو آئے گی

چار دن پہلے گُرمیت سنگھ کا فون آیا تھا صرف ماں کو تسلی دینے کے لئے۔ وہ جانتا تھا اس وقت ماں انگاروں پر لوٹ رہی ہوگی۔ اُسے کسی پہلو چین نہ آتا ہوگا۔

’’بے بے میں بالکل ٹھیک ہوں تو فکر نہ کری‘‘۔ بیٹے کی آواز سنتے ہی ماں کے نڈھال بے جان جسم اور بے چین، بے قرار مچھلی کی طرح تڑپتی، سسکتی، ڈوبتی، مایوس روح کو ایسے ٹھنڈک محسوس ہوئی جیسے تپتے صحرا پر بوچھار پڑی ہو جیسے اندھے کی بینائی لوٹ آئی ہو۔

’’پُتر سُنا ہے وہاں بہت خطرہ ہے؟‘‘

’’خطرہ تو ہر جگہ ہے بے بے۔ کیا خطرہ وہاں نہیں ہے؟ میں سب سنبھال لوں گا تو بس اپنا خیال رکھنا۔‘‘

’’تو بس مجھے فون کرتے رہنا ورنہ مجھے چین نہیں ملے گا۔‘‘

’’اچھا بے بے رکھتا ہوں۔‘‘

پھر اُس روز کے بعد گُرمیت کا فون نہیں آیا۔ وہ جب بھی اُس کا موبائل ملاتی تو کبھی نیٹ ورک نہ ملتا تو کبھی فون بند ہوتا۔ چار دن ہو گئے بیٹے کا کوئی اتا پتا نہیں جوان بیٹا پردیس میں اکیلا اس بگڑے حالات کا نہ جانے کیسے مقابلہ کر رہا ہوگا۔ پتا نہیں کس حال میں ہوگا۔ جس حادثے کو وہ ذہن کے کسی کونے میں دفنانے کی پُر زور کوشش کر رہی تھی وہ ہی سانپ کی طرح پھنکارنے لگا تھا۔ اُس وقت تو وہ اپنے ہی ملک میں، اپنے ہی لوگوں میں اور

اپنے ہی خاندان کے ساتھ تھے تو بھی کتنوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ خونی، درندے، وحشی موالی لوگوں کے سامنے وہ سب لاچار، بے بس اور مجبور ہو گئے تھے، اُن کی آنکھوں کے سامنے اُن کے گھروں کو جلا دیا گیا تھا، سرِ عام زندہ آدمیوں کو آگ کے حوالے کر دیا گیا تھا جن کی ادھ سڑی گلی لاشیں آوارہ کتوں کی دعوت بنی تھیں، تب بھی وہ سب مل کر اِن فرقہ پرستوں کے سامنے کچھ نہیں کر پائے تھے۔ اُس کا ہنستا کھیلتا گلشن اُجڑ گیا تھا۔ پانچ نومبر 1984 کا دِن وہ کیسے بھول سکتی ہے۔ اُس دِن تو اُن کے مان سمان، اعتبار، انسانیت، دوستی، بھائی چارہ، اعتماد سب کا خون ایک ساتھ ہوا تھا۔ یہ فساد نتیجہ تھا ایک سکھ باڈی گارڈ کے ذریعہ ملک کی وزیر اعظم کا قتل۔ آپریشن بلواسٹار کے دوران شری ہرمندر صاحب میں ہوئی گولہ باری کے تحت تقریباً پانچ سو لوگوں کی جان گئی تھی۔ سرکار نے تو یہ قدم دہشت گردوں کو ختم کرنے کے لئے اُٹھایا تھا جنہوں نے پنجاب میں دہشت کا تانڈو مچا رکھا تھا اور اُس سجدہ گاہ کو ناپاک کر دیا تھا۔ اِس سے لوگوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی اور پھر بدامنی کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ بدلہ در بدلہ کی بھاونا نے ملک کے امن وامان کو پامال کر دیا جس کی چپیٹ میں بے گناہ سکھوں کو بھاری قیمت چکانی پڑی۔ وہ بھی اُن میں سے ایک تھی۔ اُس شام ابھی سُرجیت سنگھ دُکان سے لوٹا ہی تھا کہ باہر شور وغل سنائی دیا۔ وہ ابھی اپنی بیوی نانکی کو بتا ہی رہا تھا کہ شہر میں فسادیوں نے کُہرام مچا دیا ہے وہ سکھوں کو روک روک کر مار رہے ہیں جلا رہے ہیں۔ ابھی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی 'اُس کے گھر پر بھی حملہ ہو گیا'۔ سرجیت کی پگڑی پیروں میں روند کر اُسے بالوں سے کھینچتے ہوئے گلی میں لے گئے۔ وہ روتی چلاتی اُن کے پیچھے بھاگی، اُن کے ہاتھ جوڑے، فریاد کی، پاؤں پکڑے مگر سب بے اثر۔ اُن درندوں کے سر پر تو بھوت سوار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا پتی بھی اُن لوگوں کی وحشت کا شکار ہو گیا جو گلی کے دوسرے گھروں سے نکال کر زندہ جلائے جا رہے تھے۔ سب طرف ہاہا کار مچی تھی پر کوئی کسی کی مدد کے لئے نہیں آیا۔ ایسے لگتا تھا وہ ایک جنگل راج ہے نہ کوئی سرکار نہ پولیس نہ جمہوریت سب کھوکھلے الفاظ ہیں جن کا نہ وجود ہے نہ کوئی معنی...... گھنٹے بھر میں تباہی مچا کر وہ

فسادی کئی عورتوں کو بیوہ، کئی بچوں کو یتیم اور کئی بزرگوں کو بے اولاد کر گئے۔ نانکی اپنے دونوں بچوں، گرمیت اور نِنی کو اپنے ساتھ چپکائے رات بھر چلاتی اور روتی رہی تھی۔

سب کچھ لُٹ جانے کے بعد وہ دلی چھوڑ کر پنجاب میں اپنے رشتے داروں کے پاس آن بسی تھی۔ سرکار نے دنگا پیڑت لوگوں کو جان و مال گنوانے کے عوض میں چھت اور پیسہ دے کر چُپ کرا دیا تھا۔ کئی تو ایسے بھی تھے جن کو یہ بھی نصیب نہ ہو سکا۔ لیکن جو زخم اُن کے اندر ہمیشہ کے لئے اپنی جگہ بنا چکے تھے اُن کو ناسور بننے سے کون روکتا۔

زندگی کا سفر نانکی نے بہت مشکل سے طے کیا تھا۔ معصوم بچوں کی آنکھوں کے آگے اُن کے زندہ باپ کو جلایا گیا تھا اور نانکی نے اپنے بچوں میں اس درد اور نفرت کو اپنی ممتا، شفقت اور قربانی کے مرہم سے پنپنے سے پہلے ہی مٹا دیا تھا۔ وہ جانتی تھی یہ سب کھیل سیاسی لیڈروں کا ہے جو اپنے مفاد کے لئے معصوم عوام کو نشانہ بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ اُنہیں لوگوں کے درد، دُکھ اور تکلیف سے کیا غرض۔

پنجاب میں ایک نئی وبا پھیلی تھی، اپنا مُلک چھوڑ کر مغرب کی اور بھاگنے کی۔ گُرمیت جوان ہوا تو وہ بھی اِس سے بچ نہ سکا۔ ماں نے بہت سمجھایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ماں بیٹے میں جب بھی بحث ہوتی تو وہ ایک ہی بات کہتا۔

''بے بے مجھے آج بھی اپنا وہ دلّی والا گھر یاد ہے۔ کہاں وہ اتنا بڑا گھر اور کہاں یہ۔؟ بے بے میں تو زندگی کا ہر سُکھ تیرے قدموں میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ بس تو مجھے ایک بار جانے کی اجازت دے دے۔'' وہ اُس کے پاس زمین پر بیٹھ کر ماں کی خوشامد کرتے ہوئے ٹانگیں دبانے لگتا۔

''پُتر تو میرے پاس ہوگا تو مجھے زندگی کا ہر سُکھ نصیب ہوگا۔ تجھے دیکھ کر ہی تو میں جیتی ہوں۔ اگر تو بھی چلا گیا تو بتا میں کس کے سہارے دن کاٹوں گی''؟

''بے بے میں کون سا ساری عمر کے لئے کہہ رہا ہوں۔ دو سال کی تو بات ہے پھر میں آکر تجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تو نہیں چاہتی تیرا بیٹا بھی ترقی

کرے بڑا آدمی بنے؟''

''بڑا آدمی تو یہاں رہ کر بھی تو بن سکتا ہے......؟''

''بے بے نہ تو میرے پاس کسی بڑے آدمی کی سفارش ہے اور نہ ہی پیسا۔ یہاں کے حالات تو تو دیکھ ہی رہی ہے اتنا پڑھ لکھ کر بھی آج کا نوجوان بے روزگار ہے اور اِس مہنگائی میں دو وقت کی روٹی کے لئے یا تو وہ جُرم کی دنیا کی طرف چل دیتا ہے اور یا پھر حالات سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتا ہے جو ہمت والے ہوتے ہیں وہ انجینئرنگ کر کے بھی چار چار ہزار کی نوکری کے لئے غلامی کرتے ہیں۔''

اب وہ بیٹے کی بات کا کیا جواب دیتی اُس کی دلیل میں دم تھا۔ آئے دن وہ یہ سب کچھ تو سُن رہی تھی گُرمیت نے اُسے لاجواب کر دیا تھا۔ ہار کر اُسے کہنا ہی پڑا۔

''اب تو بڑا ہو گیا ہے۔ سیانی باتیں کرتا ہے۔ جا جو تیرے جی میں آئے کر۔ میں کون سا ساری زندگی یہاں بیٹھے رہنے والی ہوں۔''

''دِل سے کہہ رہی ہے نہ میری چنگی بے بے؟''

''ہاں دل سے کہہ رہی ہوں۔ جدھر بھی رہے بس خوش رہے تیری خوشی میں ہی تیری بے بے کی خوشی ہے۔''

گُرمیت خوشی سے جھوم اٹھا اور لپک کر ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ممتا بیٹے کی ضد کے آگے ہار کر بھی خوش تھی۔

گُرمیت نے امریکہ جانے سے پہلے نِنی اور اُس کے پتی جگدیپ سنگھ کو ایک ہی بات کہی تھی:

''تم دونوں کے حوالے کر کے جا رہا ہوں بے بے کو۔ میری امانت ہے پورا خیال رکھنا۔''

''ویر جی بے بے صرف آپ کی ہی نہیں ہماری بھی ہے۔ اِس طرح کہہ کر اپنا حق زیادہ جتانے کی ضرورت نہیں۔''

گُرمیت کے جاتے ہی ماں نے اُس کے لوٹنے کا انتظار شروع کر دیا تھا۔

چار دن سے نانکی کی جان حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ بس گُرمیت کی آواز سننے کو کان ترس رہے تھے۔ نہ جانے اس کا لاڈلا کس حال میں ہوگا۔ اُس کا دل کہتا کہ وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے فون بھی نہیں کر پا رہا اور نہ وہ تو جانتا ہے کہ اُس کی ماں کی جان اُس میں اٹکی ہوئی ہے۔ ہر روز نئی خبریں آ رہی تھیں کہ سکھوں کو مسلمان سمجھ کر اُن پر حملہ ہو رہا ہے کئی مسلمان اور سکھ مقامی لوگوں کے غصے کا شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

گیارہ ستمبر کی منحوس صبح ٹی وی پر جب یہ خبر دکھائی گئی کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی عمارت کو دہشت گردوں نے ہوائی جہاز کو پہلے ہائی جیک کیا اور پھر اُس سے عمارت کو اُڑا دیا۔ جہاز میں سوار سبھی مسافر اور ہائی جیکرز مارے گئے۔ اس پورے حادثے میں تقریباً تین ہزار کے قریب لوگ ہلاک ہوئے اور جو زخمی اور اپاہج ہوئے وہ الگ۔ یہ صرف حملہ امریکہ پر نہیں تھا پوری دُنیا اس سے جڑی تھی۔ تقریباً ستر ملکوں کے باشندے اس کا شکار ہوئے تھے جس سے ساری دُنیا میں ہاہا کار مچ گیا تھا۔ تین ہزار مرنے والوں کا مطلب ہے اتنے ہی گھروں کا اُجڑنا اور اُن سے جڑے ان گنت رشتوں کا زخمی ہونا، فنا ہونا۔ اس حادثے کی ذمے داری القاعدہ والوں نے لی تو ایک نیا وبال کھڑا ہو گیا۔ لوگوں کو ہر مسلمان دہشت گرد نظر آنے لگا اور کئی بے گناہ، معصوم، امن پسند مسلمان بھی لوگوں کے غصے اور نفرت کا شکار ہو گئے۔ نفرت کی آگ ایشیائی لوگوں کو نگلنے لگی۔ سرداروں کو بھی مسلمان سمجھ کر اُن پر حملہ ہونے لگا۔ ایک تو یہ بدحالی اوپر سے گرمیت کا کوئی اتا پتا ہی نہیں، ماں تو جیتے جی مر گئی تھی۔ صرف سانسیں تھیں جو اُس کے زندہ ہونے کی گواہی دے رہی تھیں۔

''بے بے تیرے بھوکے پیاسے رہنے سے کیا ہوگا۔ کیا دُنیا کے طور طریقے بدل جائیں گے؟ اُٹھ کچھ کھا پی لے نہیں تو ویر سے میں کیا کہوں گی۔ تجھے امانت کی طرح سونپ کر گیا ہے۔'' نِنی نے ماں کے نڈھال جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا۔ پریشان تو وہ بھی تھی پر اُمید اور حوصلہ کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔

پھر اُس نے گرمیت کا واسطہ دے کر ماں کو کھانا کھلا دیا تھا۔ ہر بار یہی ہوتا اور ہر

باروہ گُرمیت کی قسم دے کر ماں کو کچھ نہ کچھ کھانے پینے پر مجبور کر دیتی۔

''بے بے تو تو کبھی اتنی کمزور نہیں تھی۔ہم نے تو جینے کا حوصلہ تجھی سے سیکھا ہے پر اب تو ہمت کیوں ہار رہی ہے۔اپنے رب پر یقین نہیں رہا؟''

''رب پر تو یقین ہے مگر انسان پر نہیں۔صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے لوگ نہ جانے کیوں چین اور شانتی سے نہیں جیتے کبھی زمین کے پیچھے کبھی رنگ کے پیچھے، کبھی حکومت کے پیچھے، کبھی دولت کے پیچھے خون کی ہولی کھیلتے ہیں بے گناہ لوگوں کو مولی گاجر کی طرح کاٹ کے رکھ دیتے ہیں۔

1947 کا بٹوارا، فساد، قتل و غارت، عصمت دری بے گھر ہونے کا غم، اور پھر اُس سے ملے یہ زخم ابھی بھرے بھی نہ تھے کہ 1984 کے دنگوں نے پھر زخم ہرے کر دیئے اور اب یہ گیارہ ستمبر۔کب تک چلے گا یہ؟''کب لوگ پیار اور شانتی سے رہنا سیکھیں گے۔''

نانکی سُبک سُبک کر بچوں کی طرح رو پڑی۔نئی روئے بھی جا رہی تھی اور ماں کے آنسو پونچھے بھی جا رہی تھی۔اسے لگتا تھا کہ آج وہ ماں ہے اور نانکی اُس کی چھوٹی سی بچی۔

دونوں کے دِل انجانے خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ہر آہٹ، ہر گھنٹی پر دونوں پر امید ہو اُٹھتیں اور کوئی خبر ہاتھ نہ لگنے سے مایوسی اور بڑھ جاتی۔مایوسی اور امید کا یہ چکر ویوہ چل ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔نڈھال بے سدھ پڑی نانکی میں نہ جانے اتنی پھرتی کہاں سے آئی کہ بیٹی سے پہلے ہی لپک کر ریسور اُٹھا لیا۔

''بے بے کیسی ہے تو''؟ گُرمیت کی آواز سُن کر اُس کی آواز میں وہی پیار، ممتا وہی رعب پھر لوٹ آیا تھا۔

''تو میری چھوڑ یہ بتا تو کیسا ہے؟ ٹھیک تو ہے نہ؟ اتنے دنوں سے فون کیوں نہیں کیا تو نہیں جانتا تھا تیری بے بے کا کیا حال ہوا ہوگا؟''

''بے بے ذرا صبر تو کر......ٹھنڈ رکھ......سب ٹھیک ہے یہاں گڑ بڑ تھی اور ہم لوگ چھپے پھر رہے تھے مگر اب فکر کی کوئی بات نہیں۔

''تو مجھے بہلا رہا ہے۔ٹی وی والے بتا رہے ہیں کہ حالات تو ابھی بھی ٹھیک نہیں اور تو کہتا ہے فکر کی بات نہیں۔میں کہتی ہوں تو لوٹ آ واپس۔مجھے زندگی کا ہر سُکھ مل جائے گا بس تو گھر آ جا۔'' چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو روک نہیں پائی تھی اور رونا اُس کے اختیار سے باہر ہو گیا تھا۔

دیکھ بے بے تو رو مت۔میں کوشش کروں گا جلد آنے کی مگر آنا اتنا آسان نہیں ہے۔تو ٹھیک کہتی تھی بے بے اپنا گھر اپنا ہوتا ہے لوگوں کی حقارت اور نفرت بھری نظروں سے اپنے ملک کی روکھی سوکھی زیادہ اچھی ہے۔تو بس تھوڑا سا صبر رکھ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔''

''ٹھیک ہوتے ہوتے اگر تجھے کچھ ہو گیا تو؟

''تو فکر نہ کر۔اب مجھے کچھ نہیں ہو گا میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔''

''ایسا کیا انتظام کیا ہے تو نے جو میں بےفکر ہو جاؤں''۔دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔''ہیلو! ہیلو! گرمیتے تو سُن رہا ہے یا فون کٹ گیا؟''

''سن رہا ہوں بے بے''

''پھر جواب کیوں نہیں دیتا''۔

''میں نے اپنی پہچان بدل لی ہے۔''

اُس کی بجھی ہوئی شکستہ آواز بے بے نے سُنی تو وہ تڑپ اٹھی۔

''میں سمجھی نہیں گرمیتے۔''

''بے بے تو ناراض مت ہونا نہ ہی غصّہ کرنا۔کیا کرتا حالات ہی ایسے تھے۔اپنی جان بچانے کے لئے مجھے اپنے جان سے پیارے کیس (بال) کٹوانے پڑے۔'' اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور ماں کا دل چاہا کہ کسی طرح پنکھ لگا کر اپنے بیٹے کے پاس پہنچ جائے کاش اُوپر والے نے ماؤں کو اتنا اختیار دیا ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کے درد و غم اپنی ممتا کے آنچل میں سمیٹ لے تا نکہ اس کے بچوں کی آنکھوں سے کبھی آنسو نہ بہے اور دُور بیٹھے اُسے اُن کے لئے رونا، سسکنا، تڑپنا نہ پڑے۔کاش۔۔۔

☆☆

سفر در سفر

گارڈ کی سیٹی کی آواز سُن کر اُس کے بابا ٹرین سے اترنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُس کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ اُس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور ڈبڈبائی آنکھیں چُراتے ہوئے چپ چاپ نیچے اتر گئے۔

''شومو بچی کا خیال رکھنا پہلی بار گھر سے باہر جا رہی ہے۔''

''فکر مت کرو دادا میں ہوں نہ۔''

ٹرین دھیمی رفتار سے چلی تو شومو دادا ٹرین پر سوار ہو گئے۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی اپنے بابا کو دُھندلی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوئی تو بابا اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ پھر اُس نے آنکھوں سے بہتی گنگا جمنا کو روکنے کی بھرپور کوشش کی۔ جب گاڑی شہر سے باہر نکل آئی تو وہ اپنی سیٹ پر آرام سے بیٹھ گئی۔ پھر اُس نے اپنے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا۔ گاڑی مسافروں سے بھری پڑی تھی۔ اُس کے بالکل سامنے والی سیٹ پر ایک بوڑھی عورت اپنے بہو اور بیٹے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بہو کی گود میں ایک چھوٹی بچی گلابی فراک پہنے بیٹھی تھی۔ شومو دادا اُس کے ساتھ والی سیٹ پر اور اُن کے ساتھ والی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اپنا سامان سنبھال کر سیٹ کے نیچے رکھ رہا تھا۔ گرمی کے موسم کے باوجود چلتی گاڑی سے آتی ہوئی ہوا کے جھونکے راحت فراہم کر رہے تھے۔ وہ باہر کے نظارے دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ اس کی عمر تقریباً چودہ سال ہو گی۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب

وہ اپنے گھر سے اور اپنے گھر والوں سے دور جا رہی تھی۔ گاؤں سے باہر اُس نے کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ اُس نے تو گاؤں کے صرف کچے گھر، کھیت اور کھیتوں میں کام کرتے مزدور دیکھے ہیں جن کی ہڈیاں نمائش کرتی ہیں پسلیاں آسانی سے گنی جاسکتی ہیں اُن کا ڈھانچہ اُن کی بدحالی بیان کر دیتا ہے۔

وہ آدمی جس کے بدن پر صرف ایک خستہ حال دھوتی بندھی ہوتی ہے۔ وہ آدمی جس کا جسم کھیتوں میں کام کرتے کرتے گرمی، برسات اور سردی کے تھپڑے سہہ کر جھلس چکا ہے، جس کی آنکھیں بالکل ویران ہیں، جس کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہیں آئی۔ آئے بھی کیسے؟ لوگوں کے کھیتوں میں وہ اناج اُپجاتا ہے اور خود دن رات اپنا اور اپنے پروار کو ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا مہیا کرانے کی فکر اور کوشش میں جُٹا رہتا ہے۔ اس کے بابا بھی تو انہیں میں سے ایک ہیں۔ صبح منہ اندھیرے وہ لوگوں کے کھیتوں پر کام کرنے نکل جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ گھر پر چھ فرد منہ کھولے پیٹ کی آگ بجھانے کو اُس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ماں بابا کے علاوہ تین چھوٹے بھائی اور ایک چھوٹی بہن ہے۔ تیز رفتار گاڑی اسے سب سے دور لے جا رہی ہے۔ بڑھتی گاڑی کے ساتھ فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

''دادا ہم دلی کب پہنچے گے''؟ اُس نے شومو دادا سے بنگلا میں پوچھا۔ جو ساتھ بیٹھے آدمی کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف تھا۔

''دادا۔۔۔''

'کل شام پہنچ جائے گے''۔ اُس نے بنا اُس کی طرف دیکھے بنگلا میں ہی جواب دیا۔

سامنے والی سیٹ پر ماں کی گود میں بیٹھی بچی گُوگاں کی آوازیں نکال کر اُسے بُلا رہی تھی۔ وہ بھی بچی کو دیکھ کر مسکرائی اور دُور سے ہی اس کے ساتھ اشاروں میں کھیلنے لگی۔ بچی کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''کیا نام ہے تمہارا''؟ بچی کی ماں نے پوچھا۔

وہ اُسے خالی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ کیونکہ وہ صرف بنگلہ جانتی تھی اور وہ لوگ بنگالی نہیں تھے۔

شومودادا نے اُسے نام بتانے کو کہا۔

''تمما''

''کہاں جا رہی ہو''؟

''تمما'' اُس نے پھر سے اپنا نام دُہرایا۔

''دلی جارہے ہیں صاحب۔ یہ میری بھتیجی ہے۔ اسے صرف بنگلہ آتی ہے۔''

پھر وہ دیر تک اُس بچی کے ساتھ کھیلتی رہی۔ اُسے اپنی چھوٹی بہن ارپتا یاد آ گئی جو ابھی ماں کی گود سے باہر نکلی تھی۔ ویسے تو سبھی بہن بھائی ماں سے زیادہ اُس کی گود میں پلے بڑھے ہیں۔ ننی سی تمما کھیلنے کودنے کی عمر میں ہی بہن بھائیوں کی ماں بن گئی۔ ماں گھر کا کام کاج کر کے زمین دار کے گھر کام کرنے چلی جاتی تھی تو وہ ہی ان سب کا ماں بن کر خیال رکھتی۔ گاؤں کے آخری چھور پر اُن کا چھوٹا سا کچا گھر جس کے آنگن میں آم کے درخت کی چھاؤں میں وہ اُن کے ساتھ کھیلا کرتی۔ کبھی کبھی وہ اُن سب کو گھر چھوڑ اپنی سہیلیوں کے ساتھ لوگوں کے باغ باغیچوں سے پھل توڑ توڑ کر اُن کے لئے لے آتی اور کبھی سب کے ساتھ گاؤں کے تالاب پر چلی جاتی اور سب مل کر مچھلی پکڑنے کی کوشش کرتے۔ جب وہ کامیاب ہو جاتی تو اُسے ایسے سنبھال کر لاتی جیسے بہت نایاب خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ اُسے بے صبری سے ماں کے گھر لوٹنے کا انتظار ہوتا کہ کب وہ اُن کو مچھلی پکا کر کھلائے گی۔ ماں جب گھر میں داخل ہوتی تو سب سے پہلے اُن کی نظر زمین دار کے گھر سے ملے بچے کھچے کھانے پر ہوتی۔ کھانا چاہے کتنا بھی ہوتا مگر ہوتا بڑا لذیز۔ اُس کی مہک سے منہ سے پانی ٹپکنے لگتا۔ اُس کی خوشبو سے ہی اُس کا ذہن تصور کرتا کہ وہ تقریب کا کھانا کھا رہی ہے۔ اُس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ کھانے کی خوشبو محسوس ہونے لگی تو اُس نے آنکھیں کھول دی۔ سامنے والے سبھی کھانا کھا رہے تھے۔ اُسے بھی بھوک محسوس ہونے لگی۔ اُس نے شومودادا

کی طرف دیکھا وہ اب بھی تاش کے پتوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ اُس کے پیٹ میں چوہے کودنے لگے۔ بوڑھی عورت سے اُس کی حالت چھپی نہ رہ سکی۔ اُس نے بہو سے کہہ کر اُس کے لیے بھی پلیٹ میں کھانا ڈال کر اُس کی اور بڑھا دیا۔ پہلے تو وہ نانا کرتی رہی اور جب شومودادا نے اجازت دے دی تو اُس نے چپ چاپ کھانا لے لیا۔

گاڑی اپنی تیز رفتار سے منزل کی اور بڑھتی ہی جارہی تھی۔ کھڑکی سے ڈوبتا سورج اُسے بہت بھلا لگ رہا تھا۔ آسمان پر پھیلی لالی اس سے پہلے اتنی خوبصورت اس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ سورج کی روشنی کو دھیرے دھیرے رات کے اندھیرے نے نگل لیا اور چاند آسمان پر اپنا حُسن لئے نمودار ہوا اور چاروں طرف اپنی چاندنی بکھیرنے لگا۔ گاڑی کے اندر مدھم روشنی جل اُٹھی۔ مسافر کھا پی کر سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ سامنے والے بھی سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ بچی ماں کی گود میں سو چکی تھی۔ شومودادا نے بھی اُسے سب سے اُوپر والے برتھ پر سونے کے لئے چڑھا دیا۔ لیٹتے ہی اُسے اپنے بستر کی یاد آ گئی۔ کیسے اُس کے چھوٹے بھائی بہن اُس کے ساتھ چپک چپک کر سونے کے لئے آپس میں لڑتے تھے۔ چھ ماہ پہلے جب رات کی خاموشی میں بستر پر لیٹے اُس نے بابا کو ماں سے کہتے سنا تھا کہ ''کلوں اپنے گھر کی مرمت کروا رہا ہے۔ یہ برسات تو اُس کی بے فکری میں گذرے گی۔''

''رُپالی پیسے بھیج رہی ہے کیا شہر سے''؟

''وہی یہ سب کر رہی ہوگی ورنہ کلوں کے گھر تو ایک وقت کا کھانا بھی محال تھا۔ اولاد اچھی ہو تو نرک سے نکلا جا سکتا ہے۔''

اُس وقت اسے معلوم نہ تھا کہ وہ بھی گھر والوں کو غربت کے نرک سے نکالنے کا ذریعہ بنے گی۔ ایک روز بابا کی ملاقات شومو سے ہوئی تو انہیں سیاہ اندھیری رات میں ایک اُمید کی کرن نظر آئی۔ شومو انہیں کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ کئی سال پہلے جب ان کا گاؤں باڑ کی چپیٹ میں آ گیا اور گاؤں کے گاؤں تباہ ہو گئے، کئی جانیں باڑ کی بلی چڑھ گئیں تو شومو ہمیشہ کے لئے گاؤں چھوڑ پہلے کلکتہ اور اب دلی میں جا بسا۔ وہ ایک کمیشن ایجنٹ کا کام کرتا

تھا۔گاؤں کے لوگ اُسے مسیحا سمجھتے ہیں۔ نہ صرف اپنے گاؤں بلکہ آس پاس کے گاؤں میں
بھی اُس کا بول بالا ہے۔ وہ لڑکیوں کو شہر لے جاتا ہے اور انہیں کام دلاتا۔ کمیشن وہ گاؤں
والوں سے نہیں بلکہ دوسری پارٹی سے لیتا ہے۔ جب گاؤں کی لڑکیاں جوانی میں قدم رکھنے
کی تیاری کر رہی ہوتی ہیں تو غریب ماں باپ کو وہ یاد آجاتا ہے اس کا فرض صرف انہیں ایک
بار کام پر لگانے تک محدود رہتا اُس کے بعد اُس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی۔ اُس کی بلا سے وہ
چاہے دس بار کام بدلے یا شادی کرا کر گھر بسا لے یا پھر آسان کمائی کے دوسرے وسیلے
تلاش کر لے۔ پہلے تو شومو کا دو تین مہینے بعد چکر لگ جاتا تھا اور وہ ایک ساتھ تین چار
لڑکیوں کو شہر لے جاتا تھا چاہے وہ کس عمر کی ہو مگر جب سے سرکار نے بال مزدوری کے
خلاف قانون بنایا تھا، اُس جیسے کئی ایجنٹ پولیس کی نظروں میں آ گئے تھے۔ راجدھانی میں
سختی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا دھندہ بھی مندا پڑ گیا تھا۔ اب وہ ایک چکر
میں صرف ایک دو لڑکیاں ہی لاتا تھا اور کم عمر کی لڑکیاں تو بالکل ہی نہیں۔ وہ تو تمیا کا بابا اُس
کے دور پار کے رشتے میں سے تھا اور بہت منتیں کر رہا تھا۔ پچھلی بار تو اُس نے ٹال دیا مگر
اس بار وہ اس لئے راضی ہو گیا کہ خالی ہاتھ جانے سے بہتر ہے اسے ہی بھتیجی بنا کر لے
جائے۔ اب آس پاس کے علاقے میں کئی شومو پیدا ہو چکے تھے اس کا اثر بھی اُس کے
دھندے پر پڑا تھا۔

اُس رات بابا نے ماں سے کہاں تھا۔

''شومو بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ کہتا تھا ابھی یہ چھوٹی ہے۔ مگر میں نے منتیں
کر کے اُسے منا لیا۔''

''کیا وہ اسے دلی لے جائے گا؟''

''ہاں''

''سنا ہے دِلی بہت دور ہے کلکتہ میں کام مل جاتا تو اچھا ہوتا وہ تو پاس ہی ہے۔''

''پاس ہوتا ہے تو بچوں کا دل کام میں نہیں لگتا پھر ماں باپ بھی ملنے بھاگے چلے

جاتے ہیں اور بڑے لوگ یہ سب پسند نہیں کرتے۔ دُور ہو گا تو لڑکی سال دو سال میں ایک
بار ہی گھر جا سکے گی۔''

''اب میری بچی بھی اتنی دور چلی جائے گی۔ وہ ہمارے بنا کیسے رہ پائے گی''؟
ماں کی آواز بھر آئی تھی۔

''اب تو رونا دھونا بند کرو۔ لوگوں کے بچے بھی تو گھر سے باہر جاتے ہیں۔ بہت
مشکل سے تو شومو مانا ہے بس اُس کے جانے کی تیاری کرو۔ رونے دھونے سے کچھ نہیں
ہونے والا۔''

ماں باپ کی باتیں سُن اس نے اپنے ساتھ سوئے بہن بھائیوں کو اپنے ساتھ چپکا
لیا۔ اُس کی آنکھوں سے پانی چھم چھم برسنے لگا۔ اُس کی ہچکیاں سُن ماں اُس کے پاس آ گئی۔
اسے پیار سے سینے سے لگا لیا مگر آج روتے روتے کب اُس کی آنکھ لگ گئی اسے پتا ہی نہ چلا۔

نئی صبح کے ساتھ اُس نے بھی نئی زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

اُسے کام ملے گا۔

بھر پیٹ کھانا ملے گا۔

پہننے کو اچھا کپڑا ملے گا۔

ماں بابا کو بھیجنے کے لئے پیسے ملے گے۔

بہن بھائی بھی بھر پیٹ کھانا کھائے گے۔

اُس کا کچا گھر پکا بن جائے گا۔

پھر برسات میں راتیں ٹپکتی چھت کی طرف دیکھ دیکھ جاگ کر نہیں گزارنی
پڑے گی۔

پھر اُس کے ماں بابا کا نرک بھی ڈھل جائے گا۔

وہ شہر میں جا کر خوب محنت کرے گی۔ اپنے مالکوں کو کبھی شکایت کا موقعہ نہیں
دے گی۔ ننھی ننھی معصوم آنکھوں میں بڑے بڑے سپنے سجا لئے۔ گاڑی تیز رفتار سے اُسے

منزل کی طرف لئے بڑھ رہی تھی۔

گاڑی میں لوگوں کی ہلچل سے اُسے محسوس ہوا کہ اب دلی دُور نہیں۔ مسافروں نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے پاس تو ایک چھوٹا سا تھیلا تھا جس میں ماں نے چند پرانے کپڑے سنبھال کر ڈال دیئے تھے۔ شام ڈھل رہی تھی مگر سٹیشن پر دن کے اُجالے جیسی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سٹیشن پر لوگوں کا سیلاب دیکھ کر وہ حیران اور پریشان ہوگئی۔ سبھی تیز تیز نہ جانے کس طرف چلے جا رہے تھے۔ اُسے ایسے محسوس ہوا کہ کہیں آگ لگ گئی اور وہ سب اسے بجھانے جا رہے ہیں۔ اُس نے کاندھے پر اپنا تھیلا لٹکا لیا اور شومو دادا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کبھی دھکا ادھر سے پڑتا تو کبھی دوسری طرف سے اور کبھی پیچھے سے دھکا اس طرح پڑتا کہ وہ خود بخود آگے بڑھتی جاتی۔ گاڑیوں اور لوگوں کے شور میں کسی نے اُونچی آواز میں شومو دادا کو پیچھے سے پکارا۔ اُنہوں نے پلٹ کر دیکھا تو اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگے۔ اُن کے قدم سے قدم ملانے کے لیے وہ تیز تیز چلنے لگی جیسے وہ بھاگ رہی ہو۔ پیچھے سے آنے والی آواز جب قریب ہوئی تو شومو دادا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور وہ اس طرح تیز بھاگے کہ اس کا ہاتھ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ آگے بھاگے چلے جا رہے ہیں اور دو پولیس والے اُن کے پیچھے اُنہیں پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھیڑ میں اوجھل ہوگئے۔ اُس کے قدم وہی جم گئے۔ بھیڑ اس کو چیرتی ہوئی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُسے لگا لوگوں کے سمندر میں وہ بالکل تنہا ہے اتنی دُنیا مگر کوئی اپنا نہیں۔ انجان جگہ، انجان زبان، اجنبی چہرے۔ ڈر کے مارے وہ زور زور سے رونے لگی۔ چند لوگ اُس کا رونا سُن کر رک گئے۔ اُس سے کچھ پوچھ رہے ہیں پر وہ اُن کی بات سمجھ نہیں رہی ہے۔ اُسے چپ کرانے کی کوشش کر رہے ہیں اُسے حوصلہ دے رہے ہیں وہ تو چُپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔

وہ اپنے گھر سے اتنی دُور چلی آئی ہے اُسے تو صرف اپنے گاؤں کا نام پتا ہے۔ اُس کے پاس تو واپس جانے کے لئے پیسے بھی نہیں ہے۔ اب وہ کیا کرے کہاں جائے؟

دن ڈھل چکا ہے۔ رات کے سائے بڑھنے لگے ہیں۔ پتا نہیں اُسے اس انجان شہر میں کوئی مددگار نصیب ہوگا یا پھر ہزاروں بدنصیب لڑکیوں کی طرح وہ بھی بدنام اور گمنام اندھیروں میں کہیں روٹی کپڑے کے سپنے لئے کھو جائے گی۔

☆☆

زخمِ انا

اس کے پاؤں آج کل زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ تو ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اس کا خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔ ہواؤں میں وہ اس لیے نہیں اڑ رہی تھی کہ اسے امن سے عشق ہو گیا تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی کہ اس کی شادی اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں ہو۔ وہ متوسط طبقے کی مجبوریوں اور چھوٹی چھوٹی خواہشات مار کر جینا نہیں چاہتی تھی۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ وہ نہ صرف امیر گھرانے سے تھا بلکہ اس پر جان بھی چھڑکتا تھا۔ اس کا منہ دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ امیر لڑکوں والے عیوب سے وہ کوسوں دور تھا۔ دیکھنے میں بھی بانکا جوان اور اپنے نام کی طرح ہی صابر مزاج۔ اس نے کتابوں اور موسیقی کے علاوہ کوئی اور شوق نہیں پالا تھا۔ اس کی زندگی میں آنے والی وہ پہلی لڑکی ہے، اس بات سے مونا متفق تھی۔ وہ تو اسے بچپن سے جانتی تھی مگر اتنے عرصے بعد ان کی ملاقات بھی اتفاق سے ہوئی۔

پردیس میں انجان لوگوں کے بیچ اگر کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر آ جائے تو بے حد خوشی ہوتی ہے۔ یہی امن کے ساتھ بھی ہوا۔ اپنے گھر سے دور اپنے وطن سے دور کینیڈا میں پچھلے تین سال سے اس ماحول اور تیز رفتار زندگی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ ہر طرف لوگوں کا ہجوم پھر بھی تنہا ہونے کا احساس دل میں چبھتا رہتا۔ ماں باپ کی مرضی کے خلاف ضد کر کے اتنی دور چلا آیا تھا۔ اسے اپنے پاپا کے کاروبار میں دلچسپی

نہیں تھی۔ وہ تو اپنی شناخت خود بنانا چاہتا تھا۔ اسی لیے گھر کے عیش و آرام چھوڑ کر چلا آیا۔ گھر سے دور رہ کر ماں باپ کا لاڈ اور چھوٹے بھائی کی شرارتیں یاد آتیں تو آنکھیں نہ چاہتے ہوئے بھی چھلک اٹھتیں۔ ایسی ہی ایک شام وہ لوکل ٹرین سے کام سے لوٹ رہا تھا کہ اجنبی لوگوں کے بیچ ایک چہرہ جانا پہچانا سا لگا۔ درمیانہ قد، گول چہرہ، کاندھے تک کٹے بال، چست جینز اور اس پر چھوٹی سی ٹاپ۔ گندمی رنگ ہونے کے باوجود اس میں بلا کی کشش تھی۔ یہ تو مونا ہی تھی اس کے اسکول کے زمانے کی ہم جماعت۔ اسے پہچانتے ہی وہ اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ نظریں ملتے ہی وہ خوشی سے اچھل پڑی اور خاموش ماحول کو توڑتی ہوئی بے ساختہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور دوسرے ہی پل وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے بے خبر ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ باتوں کے دوران ہی اس نے بتایا کہ وہ ہوٹل مینجمنٹ کی ڈگری حاصل کرنے آئی ہے۔ پڑھائی اور کام ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور لڑکیوں کے ساتھ ہی کرائے کے مکان میں رہ رہی ہے۔ جان پہچان تو پہلے سے ہی تھی۔ اب ملاقاتیں بھی بڑھنے لگیں اور بڑھتی ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ نزدیکیاں بھی بڑھ گئیں۔ امن ایک جذباتی اور حساس دل لڑکا جو صرف دل سے ہی سوچتا تھا اور دوسری طرف مونا بہت دور کی اور دماغ سے سوچ کر چلتی تھی۔ نفع نقصان دونوں تول کر۔ اپنے اپنے گھروں سے دور انجان ملک میں اجنبی لوگوں نے انہیں بہت قریب کر دیا۔ فرصت کا وقت وہ اکثر ایک ساتھ بتانے لگے۔ پرائے لوگوں میں ایک اپنا مل جانے سے زندگی آسان ہی نہیں رنگین بھی ہو گئی تھی۔ دونوں نے مل کر کئی خواب دیکھ ڈالے۔ اس دن تو دونوں کے لیے بہت خوشی کا دن تھا جب امن کو کینیڈا کی مستقل شہریت کی خبر ملی۔ اس خوشی کو یادگار بنانے کے لیے دونوں نے اچھے سے ہوٹل میں پہلے Candle Light ڈنر کیا، ڈانس فلور پر جوان جسم تھرکتے رہے، امنگیں مچلتی رہیں اور پھر باقی کی رات بانہوں میں بانہیں ڈالے سمندر کے کنارے گھومتے رہے۔ ڈوبتی ابھرتی لہروں کی طرح جوان امنگیں بھی مچلتی رہیں۔ اس دن کا وہ ایک ایک پل جینا چاہتے تھے۔

جس روز سے امن کو کینیڈا کی مستقل شہریت ملی تھی، اسی روز سے مونا کا دماغ تیز دوڑنے لگا تھا اور اس نے شادی کے خواب دیکھنے اور اسے انجام تک پہنچانے کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد امن سے اس کی شادی ہو جائے کہیں اتنا اچھا لڑکا اس کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ایک شام اسی طرح دونوں گھوم پھر کر دیر رات جب مونا کو چھوڑنے امن اس کے گھر پہنچا تو مونا نے ہی کہا:

''یہ روز روز لینے اور چھوڑنے کا جھنجھٹ ہی کیوں نہیں ختم کر دیتے؟''

''ماں پاپا سے اس سلسلے میں بات کرنی پڑے گی۔''

''کیوں نہ ہم ایک ساتھ رہنا شروع کر دیں جب تک شادی نہیں ہوتی۔ خرچ بھی بچے گا اور وقت بھی بچے گا۔''

''میرے پاپا کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئے گی۔''

''انہیں کون بتائے گا؟''

''میں بات چوری نہیں رکھ سکتا۔ تمہیں پیار کرتا ہوں کوئی گناہ نہیں۔''

''پھر تمہیں جلد ہی گھر بات کرنی ہوگی کیونکہ آج پاپا کا فون آیا تھا وہ بھی شادی کی بات کر رہے تھے۔ ان کی نظر میں ایک اچھا لڑکا ہے۔'' اس نے دوسرا پینترا پھینکا۔

''تم کیا چاہتی ہو؟'' اس نے غور سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''Of Course میں تمہیں چاہتی ہوں۔''

''پھر پریشانی کیا ہے؟''

''مجھے اپنے پاپا کو جواب دینا ہے۔ تم نے تو ابھی اپنے گھر بات بھی نہیں کی۔ اور اگر وہ نہ مانے تو کیا پھر بھی شادی کرو گے؟''

''وہ جانتے ہیں تم میری بہت اچھی دوست ہو۔ میں نے آتے وقت ماں سے وعدہ کیا تھا کہ شادی ہندوستان میں ان کی مرضی سے کروں گا۔''

''اور اگر انہوں نے مجھے پسند نہیں کیا؟''

''تم بیکار کی فکر کر رہی ہو۔ اگر وہ تمہیں پسند نہیں بھی کریں گے تو بھی میں انہیں راضی کر ہی لوں گا۔ کیونکہ وہ میری خوشی کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ بات تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

اسے تو اس نے تسلی دے دی مگر اسے معلوم تھا کہ ماں پاپا اس شادی سے خوش نہیں ہوں گے۔ کیونکہ جس طرح کی لڑکی ماں چاہتی تھی مونا ویسی بالکل نہیں تھی۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا جس روز اس نے اپنے دل کی بات ماں سے کہی۔ اسے معلوم پڑ گیا تھا کہ آنے والے دن پریشانیاں لے کر آئیں گے۔ اپنا پیار اور خوشی حاصل کرنے کے لیے اسے سام دام ڈنڈ بھید کسی طرح بھی ماں پاپا کو راضی کروانا ہی ہوگا۔

مونا کے ماں باپ کو بھلا اس رشتے سے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو یہاں تک راضی تھے کہ بیشک وہ ان کی غیر موجودگی میں وہیں شادی کر لے مگر امن اِس کے لیے راضی نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ماں پاپا اس سے زیادہ دن ناراض نہیں رہ سکتے۔ اور وہی ہوا۔ جب وہ ہر طرح سے بیٹے کو سمجھا بجھا چکے، پیار سے، غصے سے، تو بیٹے کی ضد کے آگے ہمیشہ کی طرح ہتھیار ڈال دیئے۔ انہیں بہو سنسکاری اور خاندانی چاہیے تھی مگر بیٹا گنوا کر نہیں۔

ان کی ہاں سنتے ہی اس نے اپنا اور مونا کا ہندوستان جانے کا پروگرام بنا لیا۔ بیٹے کی خوشی کی خاطر وہ رشتے کے لیے مونا کے گھر جا پہنچے۔ دونوں نے مل کر شادی کی تاریخ طے کی اور تیاریاں شروع کر دیں۔ مونا کو اس نے شادی سے مہینہ پہلے ہی روانہ کر دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے مونا کو قبول کر لیا اور امن کے کہنے پر ہی اس کی پسند کی خریداری شروع ہو گئی۔ جس جس چیز پر اس نے ہاتھ رکھا، انہوں نے آنکھیں بند کر کے لے لی۔ اب انتظار تھا تو امن کے آنے کا تا کہ شادی کی رسوم شروع کی جائیں۔

اتنا جھکنے کے باوجود انہیں اس رشتے سے تسلی نہیں تھی۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے دونوں سمدھیوں کی آپس میں کوئی بات نہیں ہو رہی تھی۔ شادی کی جو بھی تیاریاں کرنی تھیں اس کی بات لڑکی والے امن سے کر رہے تھے اور امن اپنے ماں باپ سے، وہ جو کچھ

بھی کروانا چاہتے تھے وہ مونا امن سے کہلوا رہی تھی۔ اور ماں باپ جانتے تھے کہ ان کا بیٹا مونا کی ہی بولی بول رہا ہے۔ اس کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔ شادی کے بعد تو لڑکے پرائے ہو ہی جاتے ہیں، یہ تو ابھی سے ان کے ہاتھ سے گیا۔

ابھی امن کینیڈا میں ہی تھا کہ مونا نے شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔

''تمہارے ممی پاپا مجھ سے اچھی طرح نہیں ملے۔ مجھے نہیں لگتا وہ مجھے دل سے قبول کریں گے۔ مجھے تو گھٹے گھٹے ماحول میں رہنے کی عادت نہیں نہ جانے کل کیا ہوگا؟''

''میرے ہوتے تم فکر کیوں کرتی ہو، میں ہوں نا۔ سب سنبھال لوں گا۔''

یہ روز روز کی کچ کچ سے بچنے کے لیے اس نے اپنے پاپا سے آرام سے بات کی۔ انہیں اپنی بات سے متفق کروایا اور یہ بھی گزارش کی کہ وہ ماں کو سمجھا دیں اور اپنے دوست کو سجا سجایا (Furnished) فلیٹ دیکھنے کے لیے کہہ دیا۔

ماں کو یہ خبر سن کر بڑا دھکا لگا۔ اس نے جھٹ سے فون ملا دیا اور بیٹے پر برس پڑی:

''یہ میں کیا سن رہی ہوں تو شادی کے بعد الگ فلیٹ میں رہے گا۔ تین سال بعد آ رہا ہے اور وہ بھی تین چار مہینے کے لیے اس پر تجھے گھر بھی الگ چاہیے۔ اتنا بڑا گھر کس کے لیے ہے؟''

''ماں شانت ہو جاؤ۔ میری بات تو سنو۔ میں جانتا ہوں آپ کو مونا پسند نہیں آپ میری خوشی کے لیے اسے قبول کر رہے ہیں۔ کل کو آپ دونوں میں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے کہ ملنے سے بھی بیزار ہو جائے۔ اس لیے تھوڑا فاصلہ بہت ضروری ہے۔ تھوڑا فاصلے رہے گا تو پیار بھی بنا رہے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی زبان آپ کے آگے کھل جائے۔''

''بیٹے تو شادی کے بعد پرائے ہوتے ہیں۔ نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے اس نے تجھ پر تُو تو ابھی سے بیگانہ ہو گیا۔''

''ماں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں آج بھی تمہارا وہی امن ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں آپ کو بھی پیار کرتا ہوں اور اسے بھی۔ اپنے بیٹے پر بھروسہ رکھو ماں۔''

ماں کا دل تھا کیسے شانت ہو جاتا۔ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتی رہی۔ پتی نے آ کر اپنے طریقے سے سمجھایا:

''اتنا غصہ ٹھیک نہیں امن کی ماں۔ اگر تیرا بیٹا وہیں شادی کر لیتا اور ہمیں نہ بتاتا نہ بلاتا تو ہم کیا کر لیتے؟ اس نے ہماری خواہشوں، محبتوں کا مان رکھا ہے۔ تم بھی اس کے جذبات سمجھنے کی کوشش کرو اور اس کی خوشی میں شامل ہو کر اسے دوبالا کر دو۔ پھر دیکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ بے چین دل کو قرار آیا۔ اس نے اس بات پر بھی سمجھوتہ کر لیا اور بنا شکن ڈالے بیٹے کا یہ فیصلہ بھی منظور کر لیا۔

شادی کے کارڈ چھپ گئے، بٹنے بھی شروع ہو گئے۔ شادی سے پانچ روز پہلے ہندوستان پہنچنے کا پروگرام تھا امن کا مگر خوشی اس سے تنہا ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے شادی سے دس دن پہلے ہی بنا کسی کو اطلاع دیئے گھر پہنچ گیا۔ ماں باپ اسے سامنے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑے۔ اس طرح کے Surprise کی انہوں نے کبھی امید نہیں کی تھی۔ خوشی آنکھوں سے چھلک رہی تھی تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور وہ پل وہ لمحے بہتے آنسوؤں کے ساتھ سارے گلے شکوے بہا کر لیے گئے۔ موسم ایک دم صاف اور خوشگوار ہو گیا۔ خوشی سے جھومتا دل میں مچلتے جذبات اور اپنی محبوبہ کو جلد سے جلد ملنے کی تمنا لیے وہ اپنے بھائی کو لے کر مونا کے گھر جا پہنچا۔ وہ سمجھا تھا اسے اچانک اس طرح سامنے دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل پڑے گی۔ مگر وہ اسے اس گرم جوشی سے نہیں ملی جس کی اسے امید تھی۔ اسے اس بات کا غصہ تھا کہ وہ دو دن سے اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اسے پتہ ہی نہیں کہ وہ سفر میں ہے۔ موقع ملتے ہی اس نے اپنا غصہ اس پر نکال دیا اور منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

''غصہ چھوڑ دو تم فون پر بات کرنا چاہتی تھیں میں رو برو تمہارے سامنے ہوں یہ خوشی نہیں ہوئی تم کو۔''

''اتنے دنوں بعد مل رہے ہو اور وہ بھی اپنے بھائی کو ساتھ لے آئے۔''

اس نے منہ پھلا کر کہا۔

''تمہیں تو میں بیس دنوں بعد مل رہا ہوں مگر بھائی کو تو میں تین سالوں بعد ملا ہوں۔تم یہ کیوں بھول گئیں؟''

''تمہارے پیار میں تو میں سب کچھ بھول گئی۔تم نہیں جانتے میں نے یہ جدائی کے دن کس طرح گزارے ہیں۔تم کہہ سکتے ہو میرا پیار بڑا خودغرض ہے میں تمہیں کسی کے ساتھ بانٹنا نہیں چاہتی۔''

اس کا خراب موڈ دیکھ کر وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور پیار سے سر اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔وہ پھر موم کی طرح پگھل گیا۔

''کینیڈا میں صرف میں اور تم رہیں گے۔یہاں اتنے سالوں بعد آیا ہوں میرے گھر والوں کا بھی حق ہے نا مجھ پر؟''

''ہاں یہ بھی سچ ہے۔'' ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔

دونوں نے مل کر شادی کی خریداری شروع کر دی۔امن نے محسوس کیا کہ ان دونوں کے بیچ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر تکرار ہونے لگی ہے۔اور یہ بحث اس وقت زیادہ ہوتی جب امن کا بھائی یا مونا کی بہن ساتھ میں ہوتے۔گھر والوں کی شہ پا کر اور اس کی یہ کمزوری جان کر کہ وہ اسے صرف خوش دیکھنا چاہتا ہے اور اس کی کسی بات کی مخالفت نہیں کرتا، وہ اسے dominate کرنے لگی۔جو اسے بالکل پسند نہیں آیا۔وہ اندر ہی اندر گھٹنے لگا۔اسے یہ دیکھ کر اور بھی تکلیف ہوتی کہ اس کے ماں باپ کی لاکھ کوششوں کے باوجود مونا کا برتاؤ ان کی طرف روکھا روکھا ہے۔

بیٹے کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ماں باپ پریشان ہو اٹھے۔اس وقت تو اس کے دل کی مراد پوری ہو رہی ہے مگر جو خوشی اس کے چہرے سے جھلکنی چاہیے وہ کہیں نظر نہیں آ رہی۔ماں باپ نے پوچھا تو وہ ٹال گیا۔شاید دونوں کی آپس میں کسی بات پر کہا سنی ہو گئی ہو، یہ سوچ کر وہ چپ ہو گئے۔

ابھی وہ کارڈ بانٹنے نکلے ہی تھے کہ امن کا موبائل آ گیا:

''پاپا آپ جہاں کہیں بھی ہوں واپس گھر آ جاؤ مجھے کچھ ضروری کام ہے۔''

''بیٹا سب ٹھیک تو ہے؟'' وہ پریشان ہو اٹھے۔

''فکر کی بات نہیں آپ بس آ جاؤ۔''

اسی وقت انہوں نے ڈرائیور کو گاڑی کا رخ گھر کی طرف کرنے کا حکم دے دیا۔

امن اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹا؟'' ماں نے بیٹے کے ماتھے کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔بس آپ آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

''بات کیا ہے جلدی سے بتاؤ میری جان نکلی جا رہی ہے۔''

''مجھے آپ لوگوں سے معافی مانگنی ہے۔''

''کِس بات کی؟''

''میں نے زندگی میں بہت بڑی غلطی کی۔آپ لوگوں کو بہت دکھ دیا مگر اب میں اس غلطی کو سدھارنا چاہتا ہوں۔''

''یعنی؟''

''پاپا میں مونا سے شادی نہیں کر رہا۔''

''کیا؟ کیا کہا تو نے؟ تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ سب تیاریاں ہو چکی ہیں۔کارڈ بٹ رہے ہیں اور تم کہتے ہو شادی نہیں کرو گے۔''

غصے سے ان کا چہرہ تمتمانے لگا۔

''ساری عمر پچھتانے سے تو اچھا ہے ابھی پچھتا لو۔''

''تمہیں شرم آنی چاہیے ایسی بات کرتے ہوئے۔شادی کا فیصلہ کس کا تھا۔تمہارا یا ہمارا؟''

''میرا ہی تھا۔''

''پھر؟ ہم لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔لڑکی والوں کے بارے میں سوچا تم نے؟ مونا کے بارے میں نہیں سوچا تم نے۔ بڑا دم بھرتے تھے محبت کا۔اسے کیا کہو گے؟''

''یہ فیصلہ اسی کا ہے۔ میں تو ہر بات کی طرح اس کے اس فیصلے کو بھی مان رہا ہوں۔''

''کیا کہہ رہا ہے تو؟''

''مونا جب مجھے وہاں ملی تھی تو بہت مختلف تھی۔ میں اسے خوش کرنے کے لیے اس کی ہر جائز ناجائز بات مانتا گیا اور وہ اسے میری کمزوری سمجھ بیٹھی۔اس نے آپ لوگوں کے بارے میں ایسی بات کہہ دی وہ بھی اپنے گھر والوں کے سامنے جو مجھ سے برداشت نہیں ہوئی۔ میں پھر بھی خاموش رہا مگر اکیلے میں اسے اس کی غلطی کا احساس دلانا چاہا تو وہ بھڑک اٹھی اور کہنے لگی:

''مجھے لگتا ہے ہماری نبھنے والی نہیں۔ بات بات پر جھگڑتے ہو۔ میں تو سوچتی ہوں ہمیں شادی نہیں کرنی چاہیے۔''

اس نے سوچا تھا میں شاید اس کی یہ بات سن کر گڑگڑاؤں گا کہ دیکھو ایسا مت کرو تین دن رہ گئے ہماری شادی کو میں برباد ہو جاؤں گا تمہارے بنا رہ نہیں پاؤں گا۔مگر پاپا میں بھی انسان ہوں۔رسی کو کب تک کھینچتے رہو گے کبھی تو ٹوٹے گی۔ میں نے چپ چاپ اس کا یہ فیصلہ قبول کر لیا اور کہہ دیا:

''تم سمجھدار ہو۔ جو سوچ رہی ہو ٹھیک ہی سوچ رہی ہو۔ مجھے تمہارا فیصلہ منظور ہے۔''

دو منٹ اس نے جلتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر اپنے گلے سے میری دی ہوئی چین اور انگوٹھی نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دی اور خود گھر کے اندر چلی گئی۔ میں چپ چاپ اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔ میں سوچ رہا تھا شاید پلٹ آئے گی اپنی غلطی کا احساس ہوگا تو مجھے منا لے گی مگر جب وہ دس پندرہ منٹ نہیں آئی اور نہ ہی موبائل آیا تو میں واپس

لوٹ آیا۔''

'پیار میں لڑائی جھگڑے تو ہوتے رہتے ہیں۔شاید وہ سوچ رہی ہو کہ تم اسے منانے آؤ گے۔''

''پہل اس نے کی ہے ماں میں نے نہیں۔ مجھے اس رشتے میں گھٹن ہو رہی تھی مگر پھر بھی میں ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اس نے اتنی بڑی بات اپنی زبان سے کہہ کیسے دی؟''

''اگر شادی نہ ہوئی تو بڑی رسوائی ہوگی۔لوگ طرح طرح کی باتیں کریں گے۔''

''اگر میں مجبور ہو کر شادی کر بھی لوں گا تو میں شادی کے ایک دم بعد اسے طلاق دے دوں گا۔اس حالت میں وقت، پیسہ اور دل و دماغ کا سکون بھی برباد ہوگا۔ فیصلہ آپ کا۔''

مونا انتظار کرتی رہ گئی کہ شاید ہر بار کی طرح وہ اسے منانے آجائے گا مگر اس بار چوٹ اس کی انا کو لگی تھی اس نے زندگی کا رخ ہی دوسرے طرف موڑ لیا۔ ماں باپ اسی کوشش میں جٹ گئے کہ امن کے واپس جانے سے پہلے کوئی اچھی سی لڑکی ان کے بیٹے کی شریک حیات بن کر ان کا گھر روشن کر دے۔

☆☆

بیتے لمحوں کی چبھن

اسے اس طرح اچانک اپنے سامنے دیکھ کر میں سٹپٹا گیا۔ میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ بالکل سامنے والی سیٹ پر بیٹھی تھی اس لیے نظریں چرا بھی نہ سکا۔ نظریں ملتے ہی میں نے اسے ہیلو کہا تو اس نے بھی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میرے سلام کا جواب دے دیا جس کی مجھے بالکل امید نہ تھی، میں تو سمجھا تھا مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لے گی۔ اس کے اس طرح سے مسکرانے سے میری شرمندگی تھوڑی سی کم ہوئی اور اس سے بات کرنے کا حوصلہ بھی بڑھا۔ میں اس کی بغل والی خالی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ آج قسمت سے ایک موقعہ ملا تھا اپنی غلطی کی معافی مانگنے کا جو میں گوانا نہیں چاہتا تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''بالکل ٹھیک۔''

میں نے ایک نظر اس کے سراپے پر ڈالی——ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ سہاگ کی کوئی بھی نشانی مجھے نظر نہیں آئی۔ مانگ سونی تھی، گلے میں منگل سوتر بھی نہیں تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر دل بیٹھنے لگا۔ میں نے دھڑکتے دل سے بات کا سلسلہ شروع کر دیا:

''آپ نے اب تک شادی نہیں کی؟''

''جی نہیں——اس نے مختصر سا جواب دیا۔

دو پل خاموش رہنے کے بعد میں پھر بولا۔

''مجھے آپ سے معافی مانگنی ہے۔ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا میری ایک غلطی کی وجہ سے آپ کی زندگی برباد ہو گئی——نہ جانے اپنوں کی اور لوگوں کی کتنی باتیں سننی پڑی ہو گی آپ کو۔''

''جو بیت گیا سو بیت گیا—— شاید تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ آپ خود کو ذمہ دار نہ سمجھیں اور ایک برا خواب سمجھ کر بھول جائیں۔'' اس نے بات وہیں ختم کرنے والے انداز میں جواب دیا۔

''یہ تو آپ کا بڑا پن ہے جو آپ ایسا کہہ رہی ہیں ورنہ میری غلطی تو معافی کے قابل نہیں۔''

وہ خاموش رہی۔

''اگر آپ میری بات سن لیں گی تو میرے دل پر پڑا بوجھ کم ہو جائے گا جو میں پچھلے دو سالوں سے لیے پھر رہا ہوں۔''

''آپ اپنے دل کا بوجھ کم کر سکتے ہیں کہئے کیا کہنا ہے آپ کو؟''

''یہ تو میں جانتا تھا کہ آپ پڑھی لکھی اور خوبصورت ہیں مگر کھلے دل و دماغ والی ہیں یہ آج ہی پتا چلا۔ آپ میری ماں کی پسند تھیں۔ میں نے ماں کی پسند کو اپنی پسند بنانے کی کوشش کی تھی۔ شاید ہم آج پتی پتنی ہوتے اگر شادی سے ایک روز پہلے مجھے یہ خبر نہ ملتی کہ چاندنی بہت بیمار ہے اور اسپتال میں ہے۔''

''چاندنی؟ وہ کون ہے؟''

''چاندنی میرا خواب، میرا مقصد، میرا پیار، میری زندگی۔ کالج میں وہ میری جونیئر تھی......اس سے میرا تعارف میرے دوست کے ذریعے ہوا۔ جتنی خوبصورت اتنی ہی ذہین اور چنچل——زندگی سے بھرپور——میں نے اسے کبھی خاموش اور سنجیدہ نہیں دیکھا——اس میں اتنی کشش تھی کہ میں اس کی اور کھنچتا ہی چلا گیا——اس کی شرارتی آنکھیں، دمکتا،

چہرہ کالے لمبے گھنے بال اور بل کھاتی لچکتی کمر نے مجھے کئی راتیں سونے نہیں دیا۔ ملاقات تو ہوئی پر دل کی بات نہ ہو پائی۔ کبھی اشاروں میں، کبھی گھما پھرا کر میں بات کہہ تو دیتا مگر ہر بار وہ انجان نا سمجھ بن جاتی اور میرے منصوبوں پر پانی پھر جاتا— میری ہر بات کو وہ ہنسی میں اڑا دیتی جیسے میں کوئی مسخرہ ہوں— گزرتے وقت کے ساتھ وہ میرے دل و جان میں سماتی چلی گئی پر اس کا جواب ہاں میں نہ بدلا۔

میری ایم بی بی ایس ختم ہوگئی۔ کالج چھوڑنے کا وقت آ گیا۔ الوداعی پارٹی والے دن پہلی بار میں نے اسے سنجیدہ دیکھا۔ موقعہ ملتے ہی اس کے پاس چلا گیا۔

''کیا بات ہے آج چاند پر اداسی کے بادل چھائے ہوئے ہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں پرانے ساتھی بچھڑ رہے ہیں اس لیے تھوڑا سا غم ہے۔''

''ملنا بچھڑنا تو زندگی کا دستور ہے۔ ہم بچھڑنے کے لیے ملتے ہیں اور پھر ملنے کے لیے بچھڑتے ہیں۔ پھر تم کیوں پریشان ہو رہی ہو؟ میں تو ملتا ہی رہوں گا تم اچھی طرح جانتی ہو، تم سے زیادہ دن میں دور نہیں رہ سکتا۔''

''تمہاری ان فضول باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

وہ وہاں سے جانے لگی تو میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے پھر پاس بٹھا لیا۔

''خوش نصیب ہو جو پیار تمہاری زندگی میں دستک دے رہا ہے بہت مشکل سے ملتا ہے سچے دل سے چاہنے والا— ایک بار ہاں کہہ کے تو دیکھو۔''

''مجھے ابھی اپنی پڑھائی مکمل کرنی ہے۔''

''میں انتظار کر سکتا ہوں۔''

''دیکھو کارتک اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ تم مجھے اچھے لگتے ہو تمہاری باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں— تمہارے ساتھ ہوتی ہوں تو وقت کا پتا ہی نہیں چلتا یہ صرف دوستی ہے۔ اس سے آگے کچھ بھی نہیں۔ ہم دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے غیر مذہب انسان سے شادی نہیں کی— اپنی ایک خواہش کی خاطر سب سے بیگانی نہیں ہو سکتی— ہمارا ملنا ناممکن ہے۔''

''چلو ایک بات تو مانی تم نے کہ تمہیں میری خواہش ہے۔'' چاندنی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اس نے نظریں جھکا لیں۔ میرے دل میں ایک امید پیدا ہوگئی— اس کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ اپنی چاہت چھپانے میں ناکام رہی— اس رات میری آنکھوں نے کئی سپنے دیکھ ڈالے۔

مگر میں غلط تھا۔ میں جس مذہب کی دیوار کو ریت کی سمجھتا تھا اس کی جڑیں تو بہت گہری تھیں۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی اسے بغاوت پر بھی اکسایا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

ماں کو لگتا تھا میں اچھا کمانے لگا ہوں اور میری عمر بھی ہو چکی ہے، اس لیے شادی کا دباؤ بڑھنے لگا— میری پسند تو چاندنی ہی تھی، میں ماں سے کیا کہتا جب چاندنی ہی راضی نہیں تھی— جب ماں نے قسمیں دینی شروع کر دیں تو ایک بار پھر چاندنی کے دروازے تک پہنچ گیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اب تو اس کی پڑھائی مکمل ہو چکی ہے۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہے اپنے والدین کو راضی کرنے کی کوشش کرے۔ میں نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ شادی کے بعد ہم دونوں میں سے کسی کو بھی اپنا مذہب بدلنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس بار بھی ناکام رہا۔ یہ میری آخری کوشش تھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ شاید اب یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ اب میں تمہارے دروازے پر دوبارہ نہیں آؤں گا۔ اب سے ہمارے راستے جدا جدا۔

وہ خاموش رہی— اور میں وہاں سے چپ چاپ اٹھ کر چلا آیا۔ مجھے لگا تھا شاید آواز دے کر مجھے بلا لے گی، وہ مجھ سے جدا نہیں ہونا چاہے گی، مگر میں پھر غلط ثابت ہوا۔ میں نے آ کر ماں کو شادی کے لیے ہاں کر دی— اور بس اس کے بعد تم سے وہ چھوٹی سی ملاقات اور ہماری— سگائی— شادی کی تاریخ پکی ہوگئی۔ ایک روز میں نے چاندنی کو اپنی

منگنی کی خبر سنادی اور شادی کی تاریخ بھی بتادی اس نے بھی سرد لہجے میں مبارک باد دی اور فون کاٹ دیا۔''

''پھر شادی والے دن کیا ہوا؟'' اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''شادی سے ایک روز پہلے مجھے میرے دوست نے بتایا کہ چاندنی اسپتال میں داخل ہے — یہ خبر سنتے ہی مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں اسے دیکھنے پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے بڑا صدمہ پہنچا۔ وہ ہنستی کھیلتی، چنچل، چلبلی، لڑکی ڈپریشن کا شکار ہوگئی تھی۔ وہ ہنسنا بھول گئی تھی۔ اسے چپی کھائے جارہی تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کے دل کو صدمہ پہنچا ہے اور وہ اندر ہی اندر گھل رہی ہے۔ میں سمجھ گیا اسے عشق ہوگیا ہے اور گھن کی طرح اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کررہا ہے۔

اس نے مذہب کے ٹھیکیداروں سے ڈر کر اپنی تمام خواہشات کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ تم خود ہی بتاؤ اسے اس حالت میں چھوڑ کر میں شادی کیسے رچا سکتا تھا۔ میں ساری دنیا بھول کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا — میں جانتا تھا گھر پر شادی کی تیاریاں چل رہی ہیں، سبھی رشتہ دار شادی میں شریک ہونے آئے ہیں۔ میری غیر موجودگی سے سب پریشان ہوں گے۔ میں نے پاپا کو فون پر کہہ دیا کہ آپ شادی رد کردیں، میں یہ شادی کسی قیمت پر بھی نہیں کرسکتا — بہت دیر بحث ہوتی رہی۔ مجھے معلوم تھا میں بہت غلط وقت پر اپنا فیصلہ بدل رہا ہوں، مگر تین تین زندگیاں برباد کرنے سے اچھا ہے ایک دو روز کا رونا دھونا۔ میں نے اپنا فیصلہ سنا کر موبائل سوئچ آف کردیا — بعد میں مجھے پتا چلا کہ پاپا نے شادی والے دن صبح ہی آپ کے گھر فون کرکے معافی مانگی اور اپنی مجبوری بتائی — میں سمجھ سکتا ہوں بہت تکلیف سہنی پڑی ہوگی آپ کو — بہت باتیں سننی پڑی ہوں گی آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو — آج تک اس کا بوجھ ہے میرے دل پر —

''یہ سب تو ہونا ہی تھا — شادی والے گھر میں ماتم چھا گیا۔ رشتہ دار غصے سے بھڑک اٹھے۔ پاپا اس صدمے کو برداشت نہیں کرپائے انہیں دل کا دورہ پڑ گیا اور سب کی

توجہ ان کی طرف ہوگئی — غصہ تو مجھے بھی بہت آیا تھا۔ اگر پاپا کو کچھ ہوجاتا تو میں آپ کو کبھی معاف نہ کرتی — آپ کے ممی پاپا اسپتال آئے تھے — بہت شرمندہ تھے، بار بار معافی مانگ رہے تھے کہہ رہے تھے کہ جو چاہو سزا دے دو — ان کی یہ سادگی اور شرافت دیکھ کر پاپا پگھل گئے انہوں نے یہی کہا تھا کہ بچوں کی غلطی کی سزا آپ کو کیوں ملے — پھر آپ کو آپ کے ممی پاپا نے معاف کیا کہ نہیں؟''

''معافی ملنی اتنی آسان نہیں تھی — سب کام کاج چھوڑ کر میں چاندنی کے پاس ہی رہا۔ مجھے اتنے پاس پاکر اس کی حالت میں بھی سدھار ہونے لگا۔ اس کے والدین نے مجھے دیکھا اور پرکھا، وہ سمجھ چکے تھے کہ ان کی بیٹی میرے لیے اندر ہی اندر گھٹ رہی ہے — کوئی بھی مذہب کسی انسان کی زندگی سے بڑا تو نہیں ہوتا۔ پڑھے لکھے انسان کی سوچ کا دائرہ بھی بڑا ہوتا ہے۔ چھوٹی موٹی مشکلوں کے بعد بات بن ہی گئی — چاندنی نے اپنے پیار کا اقرار کیا جب اسے اپنے والدین کی طرف سے ہری جھنڈی دکھائی دی — میرے گھر میں تو مجھ سے بائیکاٹ چل رہا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہوگیا — آج میں اور چاندنی ایک ہیں — ہمارے گھر میں عید بھی اسی طرح منائی جاتی ہے جیسے دیوالی — اس نے اپنی نماز نہیں چھوڑی اور میں نے اپنی پوجا — آج میری زندگی میں سب کچھ ہے جس کی میں نے تمنا کی تھی بس صرف ایک خلش ہے کہ میں نے آپ کی زندگی میں زہر گھول دیا — ہوسکے تو مجھے معاف کردیں — میرے دل پر پڑا بوجھ کم ہوجائے گا —''
میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگی —

اس نے میرے جوڑے ہوئے ہاتھوں کو الگ کردیا — اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں — میری طرف دیکھ کر بولی:

''آپ دل سے یہ پشیمانی نکال دیں کہ آپ نے میرے ساتھ برا کیا ہے۔ میں نے آپ کو کبھی بھی گناہ گار نہیں سمجھا بلکہ میں تو آپ کی شکر گزار ہوں۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے حیرانگی سے اس سے پوچھا۔

”میں آپ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی مگر میرے پاپا دل کے مریض تھے اس لیے میں ضد پر بھی نہیں اتری — مجھے مجبوراً ان کی مرضی کے آگے جھکنا پڑا اور امت نے مجھے بے وفائی کا تمغہ دے دیا۔ امت کنیڈا سے اتنی جلدی آ نہیں سکتا تھا اور میرے ماں باپ انتظار کرنے کو راضی نہیں تھے۔ آپ نے شادی سے انکار کر کے مجھ پر احسان کیا ہے۔ اسی مہینے کے آخر میں امت واپس آ رہا ہے اور ہم دونوں شادی کر رہے ہیں۔“

”آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”آپ مجھے پہلے کب ملے“

اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ کاش میں اس سے پہلے ملا ہوتا کم از کم پچھلے دو سالوں سے جو دل پر بوجھ لیے پھرتا تھا وہ تو کم ہو جاتا۔

☆☆

بِن گھاٹ کی ناؤ

سردیوں کی نرم گرم ملائم دھوپ کے سائے کب سے اُس کے آنگن سے ہو کر گزر چکے تھے اور شام کی ٹھنڈی تیکھی تیز ہواؤں نے اپنا رخ اُس طرف کر لیا تھا۔ ان سب سے بے نیاز وہ وہیں کرسی پر خاموش اپنے ہی خیالوں کی دنیا میں کھویا بیٹھا تھا۔ اُس کی زندگی بھی سرد شام بن کر رہ گئی تھی۔ وہ مایوسیوں کے سمندر میں ڈوبا یادوں کے تھپیڑے سہہ رہا تھا اُس کا ارادہ تو اِس سمندر میں غرق ہونے کا تھا مگر خود کو فنا کر دینا اُس کے اختیار میں کہاں تھا۔ جب تیز ٹھنڈی ہواؤں کا جبر اُس کے بوڑھے جسم کو اذیت دینے لگا تو اُسے اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوا۔ اپنے وجود کو سمیٹ کر وہ گھر کے اندر جانے کو اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تو صرف سنگیتا کی آواز کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ شاید ہمیشہ کی طرح وہ اندر سے بولتی ہوئی اُس کے پاس آئے۔

”کیا اُٹھنے کا ارادہ نہیں ہے؟ دیکھ نہیں رہے دھوپ کب کی جا چکی۔ سردی بڑھ رہی ہے اور آپ ہو کہ بس کرسی پر جم کر بیٹھ گئے۔ اٹھو اب چلو بھی اندر۔“ اور وہ چپ چاپ اُٹھ کر اندر چلا جاتا۔

دھوپ غائب ہو گئی۔ شام کے سائے بڑھتے گئے مگر اُسے وہاں سے اُٹھانے کوئی بھی نہ آیا۔ اپنی خواہشوں اپنی تمناؤں کا بوجھ اٹھائے وہ خود ہی اٹھ کر اندر چلا گیا۔

چھ مہینے پہلے والے پرمود اور آج کے پرمود میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس

ڈھلتی عمر میں بھی وہ کسی بانکے نوجوان سے کم نہیں تھا حالانکہ اس کی رنگت کی طرح سر کے بال بھی سفید ہو چکے تھے۔ دراز قد، متوسط جسم نہ پتلا نہ موٹا۔ چونسٹھ سال کی عمر میں بھی اس کا جسم ڈھلکا نہیں تھا یا تو یہ ورزش کا کمال تھا یا پھر وہ خود کو ہمیشہ سنوار کر رکھتا تھا کہ وہ اس عمر میں بھی خوب رُو، خوش لباس، خوش سلیقہ، دیدہ زیب اور پُر وقار تھا اپنی عمر سے دس سال کم لگتا۔ اس کو بنانے سنوارنے میں سب سے بڑا ہاتھ اس کی بیوی سنگیتا۔ کا تھا۔ شادی سے پہلے نہ اُسے پہننے کا اور نہ ہی زندگی جینے کا سلیقہ آتا تھا وہ تو گاؤں کا سیدھا سادہ نوجوان اپنے بڑے بھائیوں کے رحم و کرم پر شہر میں پڑھنے اور نوکری کرنے آیا تھا۔ چار بڑے بھائی تھے جو دھیرے دھیرے سبھی شہر میں آئے اور وہیں اپنے گھر بسا لیے۔ باپ کے مرنے کے بعد اُس سے بھی گاؤں چھوٹ گیا اور وہ شہر آ گیا۔ شہر آ کر اُس کا اپنا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں تھا۔ ماں جس بھائی کے پاس ہوتی وہ بھی وہیں رہ لیتا۔ پڑھائی کا خرچ سبھی بھائی مل کر اٹھا رہے تھے اور روٹی کا ذمہ بھابیوں کا تھا۔ جو بن جاتا، جتنا پروس دیتے وہ چپ چاپ کھا لیتا۔ کسی نے کبھی اُس سے اُس کی پسند نہیں پوچھی۔ کبھی کبھی تو بڑی بھابی دو روٹیاں پروس کر اُسے بھول جاتی اور جوان پیٹ کی خوراک وہ پانی سے پوری کر لیتا۔ ماں کے گزر جانے کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ بھابیوں نے مل کر دن بانٹ لیے اور اس طرح وہ باری باری ان کے گھر کھانا کھانے پہنچ جاتا۔ کئی بار تو بھابیاں اپنی باری بھول جاتیں اور اپنے کسی نہ کسی پروگرام میں مصروف ہو جاتیں اور وہ اُن کے گھر سے شرمندگی جھولی میں ڈال کر لے آتا۔ اس سلسلے کو بھی اس نے اس روز ترک کر دیا جب اس نے شام کو پارٹ ٹائم نوکری تلاش کر لی۔ بھابیوں نے بھی چین کی سانس لی۔ اب تو وہ کئی کئی روز گھر بھی نہیں جاتا تھا۔ جہاں رات ہوئی وہیں دوستوں کے ساتھ گزار دی۔ اس کی غیر موجودگی کا کبھی کسی کو احساس بھی نہ ہوا اور اسی لیے کسی نے اس کا سبب دریافت بھی نہیں کیا۔ بی۔ اے۔ مکمل ہوا تو بھابیوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا: ''برخوردار ہمیں جتنا پڑھانا تھا پڑھا دیا۔ اب نوکری تلاش کرو اور اپنا گھر بسا لو۔ ہمیں اپنی ذمہ داریاں بھی نبھانی ہیں۔''

نوکری ملتے ہی اُس نے کرائے پر ایک کمرہ لے لیا جس میں ایک چار پائی، ایک میز اور ایک کرسی بوڑھی مکان مالکن نے سجا دی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں وہ بوڑھی اماں سے کافی مانوس ہو گیا۔ لڑکے کا چال چلن اچھا تھا، دیکھنے میں گبرو جوان۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے ایسے لڑکوں کی تاک میں تو لڑکی والے ہمیشہ رہتے ہیں۔ اماں بھی یہ موقعہ گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے دور پار کی اپنی ایک بیوہ بہن کی لڑکی بہانے سے اُسے دکھا دی جس کا رشتہ کسی بھی لحاظ سے ٹھکرایا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ شادی کرا کے اماں نے دو زندگیاں سنوار دیں۔

سنگیتا کا پشتینی گھر لاہور کی سُتر منڈی میں تھا۔ اُس نے سنا تھا کہ اُس کے والد کپڑے کے تھوک کے تجارتی تھے اور شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔ پھر ۱۹۴۷ میں بٹوارے کی چپیٹ میں وہ بھی آ گئے۔ اہلِ خاندان کے ساتھ وہ اپنا گھر اپنا شہر اور اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ بدقسمتی سے وہ خود ہندوستان نہیں پہنچ سکے راہ میں ہی موالیوں کی گولیوں کے شکار ہو گئے۔ لاہور سے تو ماں سہاگن چلی تھی اور ہندوستان پہنچنے سے پہلے ہی وہ بیوہ ہو چکی تھی۔ یہ سارے قصے اُس نے صرف سنے تھے۔ نہ اس نے کبھی باپ کو دیکھا اور نہ ہی اس لاہور اور اس گھر کو جس کا ذکر کرتے ہی ماں کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے تھے۔ وہ تو ابھی ماں کے پیٹ میں ہی تھی جب اُس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ بچپن گھر کی تنگ دستی میں گزرا۔ بڑا بھائی جب نوکری پر لگا تو خوش حالی نے ان کے گھر بھی دستک دی۔ بھابی آئی تو وہ اُس کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ اپنے ہی گھر میں وہ پرائی ہو گئی۔ ماں کا صرف ایک ہی ارمان تھا کہ کسی طرح اس کے جیتے جی اس کی بیٹی کا گھر بس جائے اور اس کا یہ بوجھ بھی اس دن اتر گیا جب وہ بیاہ کر پرمود کے ساتھ اپنی گھر گرہستی بسانے چلی گئی۔

لوگ کہتے تھے کہ وہ منحوس ہے پیدا ہونے سے پہلے ہی ماں کی مانگ سونی کر دی پرمود کے گھر اس کے قدم کیا پڑے، اس کی زندگی میں لہر پہر ہو گئی۔ اس نے پھر پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ اس کی بے ترتیب، بے رنگ بھٹکتی زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا اور زندگی پیار کی خوشبو سے رنگ گئی۔ وہ تو شروع سے ہی کم گو تھا۔ کھل کر ہنسنا، لوگوں سے ملنا جلنا اُسے زیادہ

پسند نہ تھا۔ نہ خوشی کی خوشی نہ کبھی کسی بات کا غم۔ نہ کبھی کسی سے کوئی شکوہ نہ شکایت بس اگر کسی کی کوئی بات بُری لگی تو اپنے جی کو ہی جلا لیا۔ اس کے برعکس سنگیتا چنچل شوخ، خوش مزاج، خوش کردار، خوش گفتار، شائستہ، اور حساس دل کی مالک۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں خوش اور دوسرے کی تکلیف سے دکھی ہو جاتی۔ جو اس سے ایک بار مل لیتا، اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ بیگانے کو اپنا بنانے کا ہُنر اُسے خوب آتا تھا۔ دونوں کے مزاج بالکل مختلف پھر بھی دونوں کے رشتے میں پیار اور انڈراسٹنڈ نگ (Understanding) تھی۔ وہ شوہر کی خاموشی کی زبان بھی سمجھنے لگی تھی۔ وہ بھی بیوی کی ہر چھوٹی چھوٹی ضرورت اور خواہش کا خیال رکھتا مگر زبان سے کبھی اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا۔ جب سے وہ اس کی زندگی میں آئی تھی وہ ترقی کی سیڑھیاں چڑھتا ہی گیا۔ پہلے وہ اس چھوٹے کمرے سے بڑے گھر میں منتقل ہوئے اور پھر جیسے جیسے اس کے گھر میں بچوں کی کلکاریاں گونجنے لگیں اس نے بیوی کی خود کی چھت کی فرمائش بھی پوری کر دی۔ اس کی دنیا اپنی بیوی تک ہی سمٹ کر رہ گئی تھی۔ دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر۔ رشتے ناتے، یار دوست سب پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ وہ ہی اس کی واحد دوست، اس کی دنیا اور پوری کائنات تھی۔ شوہر کے دل کو اس نے پیار اور خدمت سے جیتا تھا۔

پانی کا گلاس خود اٹھا کر پینا بھول گیا تھا۔ صبح دفتر جانے سے پہلے اس کے کپڑے پریس کر کے، جوتے پالش اور رومال موزے سب تیار کر کے رکھ دیتی۔ اس سے پوچھ کر اس کی پسند کا کھانا بناتی۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ اس کے کپڑوں کی خریداری وہ اپنی پسند سے کرتی۔ بننے سنورنے کا سلیقہ اُسی نے اسے سکھایا۔ ہر چھوٹی چھوٹی چیز اور چھوٹی چھوٹی بات پر وہ اس پر ہی نربھر رہتا۔ دفتر جانے سے پہلے وہ کم از کم دس آوازیں لگا کر اُسے کچن سے کام کرتے بلاتا۔

''سنگیتا میرے وہ کاغذ کہاں ہیں؟''

''سنگیتا میرا پرس کہاں رکھ دیا؟''

''سنگیتا میرا چشمہ نہیں مل رہا؟''

وغیرہ وغیرہ

سب کام چھوڑ کر وہ بھاگی آتی اور دو منٹ میں چیز اس کے سامنے ہوتی۔

''سامنے پڑی چیز بھی آپ کو نظر نہیں آتی۔ لو پکڑو۔''

بچے بھی ماں کے زیادہ قریب تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسے بچوں سے کھل کر لاڈ کرنا ان کے نخرے اٹھانا اچھا لگتا تھا۔ صبر کا مادہ بھی اس میں ضرورت سے زیادہ تھا۔ ان کی ہر چھوٹی بڑی بات غور سے سنتی۔ دوستوں سی مستی کرتی اور ماں والا پورا رُعب بھی رکھتی۔ بچے ماں سے ہر چھوٹی بڑی بات بے جھجک کر لیتے۔ باپ کے اور ان کے درمیان ہمیشہ ایک فاصلہ حائل رہتا۔ وہ کئی بار اپنے پتی کو سمجھاتی:

''آپ اپنے پیار کا اظہار کرنا اب تو سیکھ لیں۔ بچوں نے آپ کے دل میں گھُس کر نہیں دیکھنا انہیں پیار جتایا کرو۔''

''یہ کمال تو تمہیں آتا ہے۔''

''اتنے سالوں میں یہ بھی نہیں سیکھا آپ نے مجھ سے؟''

''تم تو جانتی ہی ہو میں ایسا ہی ہوں۔ کوشش کرنے پر بھی کسی سے تو کیا خود سے بھی کھل نہیں پاتا۔ یہ تو تم ہی ہو جو میرے دل و دماغ کے دریچوں کو دستک دے دے کر کھولتی رہتی ہو۔ یہ کامیابی صرف تمہیں حاصل ہوئی ہے۔''

عادتیں کہاں بدلتی ہیں۔ وہ تو بچپن سے ہی ایسا تھا خود میں سمٹا ہوا اور بڑھاپے تک اس کی یہ عادت نہیں گئی۔ باپ اور بچوں کے بیچ وہ ایک مضبوط کڑی بن گئی اور ساری عمر انہیں جوڑے رکھا۔ دونوں نے مل کر زندگی کے اتار چڑھاؤ اور مختلف پڑاؤ ایک ساتھ طے کیے۔ بچوں کو اچھی تعلیم دی، اچھے سنسکار دیے اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بنایا۔ نوکری کے دوران ہی دونوں بیٹیوں کو ان کے سسرال رخصت کر بہو گھر لے آئے اور اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو گئے۔ نوکری سے رٹائر ہوئے تو دونوں کا ساتھ اور بڑھ گیا۔ بچے اپنی اپنی زندگی میں خوش اور مست تھے اور وہ دونوں رٹائرڈ زندگی کا ہر پل

بخوبی جی رہے تھے۔ پرمود نے تو اب گھر سے اکیلے باہر نکلنا ہی بند کر دیا تھا۔ جہاں بھی جاتے دونوں ایک ساتھ جاتے۔ جب سنگیتا گھر کے کاموں میں زیادہ مصروف ہو جاتی تو وہ ہر دو منٹ بعد اسے آواز لگا کر کسی نہ کسی کام کے بہانے بلانے لگتا۔

''اس ڈھلتی عمر میں مجھ میں وہ ہمت نہیں کہ آپ کی ایک آواز پر بھاگی چلی آؤں۔سرکار نے آپ کی عمر دیکھ کر آپ کو رٹائر کیا ہے۔اب مجھے بھی رٹائر کر دو۔''

''سب تمہیں رٹائر کر دیں مگر میں نہیں کروں گا۔''

''آپ یہ جو سارا دن سنگیتا سنگیتا آوازیں لگاتے ہو۔اُسے بھی بند کر دو۔ بہو مذاق اڑا رہی تھی اس دن۔ کہہ رہی تھی بھگوان سے زیادہ آپ کا نام لیتے ہیں پاپا۔''

''جلتی ہے وہ تم سے۔ ویسے بھی کیا غلط کہا اس نے میری بھگوان تم ہی تو ہو۔''

''اب بس بھی کرو کچھ لحاظ عمر کا بھی کرو۔''

''لو اب اس میں عمر کہاں سے آ گئی؟''

''اچھا یہ بتاؤ بلایا کس لیے تھا۔''

''یہ تو میں بھول گیا کیوں بلایا تھا۔ پہلے باتوں میں الجھا لیتی ہو اور پھر اگر میں بھول جاؤں تو ناراض ہو جاتی ہو۔''

''آپ سارا دن خالی بیٹھے رہتے ہو۔ تھوڑا باہر گھوم کر آیا کرو۔ بچوں کو ساتھ گھمانے کے لیے اُن کو بھی تو پتا چلے دادا کیسے لاڈ کرتے ہیں۔''

''اب رہنے بھی دو جو باتیں جوانی میں نہیں کیں اب کیا خاک کروں گا۔ ویسے بھی میری عادتیں بگاڑنے کی تم ہی ذمہ دار ہو۔ اب بھگتو۔''

''ہاں وہی تو کر رہی ہوں۔ پہلے تو پیار پیار میں میں نے ہی آپ کی عادتیں بگاڑ کر رکھ دیں۔ اب کیا کر سکتی ہوں۔ دیکھ لینا ایک دن بہت پچھتانا پڑے گا آپ کو۔ یاد کرو گے جب میں نہ رہوں گی۔''

''میں تمہیں جانے دوں گا کہیں تو نا؟''

''جب بلاوا آئے گا تو آپ روک بھی نہ پاؤ گے۔''

''ہر جگہ ایک ساتھ جاتے ہیں وہاں بھی ساتھ چلیں گے۔ یہ رشتہ ایک جنم کا نہیں جنم جنم کا ہے۔''

مگر جانے والے کو کون روک سکا ہے۔ ایک روز وہ بھی چپ چاپ چلی گئی۔ آج اس کی کہی باتیں اسے یاد آتی ہیں۔ اس کے ساتھ بتائے زندگی کے کھٹے میٹھے دن یاد آتے ہیں۔ اس نے تو ساتھ جینے مرنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ بے وفائی کر گئی۔ بنا کچھ کہے بنا کچھ سنے وہ اس کی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ وہ تو سب سے صرف ایک ہی بات پوچھتا وہ تو مجھے بتائے بنا کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھی پھر وہ اکیلے مجھے بتائے بنا یہ دنیا کیسے چھوڑ گئی؟''

جب کہیں سے کوئی جواب نہ آتا تو اکیلے ہی بڑبڑاتا رہتا۔ اسے سمجھانے کی سبھی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ ان چھ مہینوں میں اُس کا حُلیہ ہی بدل گیا ہے۔ وہ خود سے بے خبر سب سے بے نیاز خاموش خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاش کرتا رہتا ہے۔ جسم ڈھلک چکا ہے، نہ وقت پر کھانا نہ سونا نہ وہ روز کی ورزش نہ وہ روز کی شیو نہ وہ روز نہانا کپڑے بدلنا نہ وہ پوجا نہ وہ پاٹھ۔ کسی کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔ اسے صرف انتظار ہے اس آواز کا جو ہمیشہ کے لیے فنا ہو چکی ہے۔ نہ جانے کب وہ خلا کے بھنور سے باہر نکلے گا نہ جانے کب وقت اس کے زخموں پر مرہم رکھے گا۔ نہ جانے کب......؟

☆☆

چہرے پر چہرہ

ایک چھت کے نیچے دو اجنبیوں کی طرح رہتے انہوں نے زندگی کے ستائیس سال گزار دیئے۔ ساری عمر دونوں دنیا کے سامنے اچھے پتی پتنی ہونے کا ڈھونگ کرتے رہے۔ یہ تو وہ جانتے تھے یا ان کے چند قریبی دوست کے چار دیواری کے اندر دونوں دو دشمنوں کی طرح رہتے ہیں۔ اک دوسرے کی بات کا جواب دینے میں تکلیف ہوتی ہے اور اگر اتفاق سے آمنا سامنا ہو جائے تو نفرت سے منہ دوسری طرف موڑ لیتے ہیں اور اگر بات کرنا نہایت ضروری ہو تو اک دوسرے کو کھانے کو دوڑتے ہیں۔ دونوں کے کمرے الگ الگ ہیں کھانے پینے کا وقت بھی الگ الگ ہے۔ ایک چھت کے نیچے رہنا ان کی مجبوری ان کی اکلوتی بیٹی آنچل ہے۔ آنچل نے جب سے ہوش سنبھالا تھا ان دونوں کو اسی طرح دیکھا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ ان دونوں میں اکثر بحث اس کی غیر موجودگی میں ہوتی۔

جب شاملی بیاہ کر اس گھر میں آئی تو ہر جوان لڑکی کی طرح اس نے بھی اپنے جیون ساتھی کو لے کر کئی سپنے بن رکھے تھے۔ کالج کے زمانے میں بہت سے لڑکے ہتھیلیوں پر دل لے کر اس کے پیچھے گھومتے تھے۔ وہ خوبصورت تھی ذہین تھی سمجھدار اور ٹھہراؤ اس کے مزاج کی خوبی تھی۔ اُس نے کبھی ایسے من چلوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ صرف اور صرف محبت کا خزانہ اپنے شوہر پر لٹانا چاہتی تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ اُسے ایسا شوہر ملے جو اُسے دیکھ کر کسی کو نہ دیکھے اُس کی چاہت صرف اُس کے لیے ہی ہو اور جو صرف اسے دیکھ کر ہی

جیے۔ کل یگ میں اسے رام کی تلاش تھی۔ راکیش سے شادی کے دو ماہ بعد ہی اس کے خواب ریزہ ریزہ کر کے بکھر گئے۔ راکیش زندگی سے بھرپور ہر لمحیں کا لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ موج مستی، پارٹیاں، سب سے ہنسی مذاق، لڑکیوں سے کھلا مذاق گھومنا پھرنا اسے بے حد پسند تھا۔ اس کے برعکس وہ ندی کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح جو ان سب باتوں سے دور بھاگتی تھی۔

دونوں کی سوچ اُن کی عادتیں بالکل مختلف تھیں۔ پھر بھی شاملی نے اُمید کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ایک روز وہ اسے اپنے پیار کے رنگ میں رنگ لے گی یا اُس کے رنگ میں خود رنگ جائے گی۔ اس بیچ ان دونوں کو جوڑنے کی ایک کڑی بن گئی۔ ان کی زندگی میں ایک امید نے دستک دی۔ ایک ننھی کلی نے دونوں کو ایک کرنے کے لیے جنم لیا۔ دونوں خوش تھے مگر یہ خوشی ان کی عارضی تھی۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اُس اکیلی کی کوشش کیا رنگ لاتی جب راکیش نے اپنا رنگ ڈھنگ ہی نہ بدلا۔ دن گزرتے گئے۔ ناکامی نے اُس کے صبر کے پیمانے کو چھلکا دیا اور دل میں جمع ہوئی کڑواہٹ نے اُس کی زبان بھی کڑوی کر دی۔ سلسلہ گلے شکوے سے شروع ہو کر تو تو میں میں تک پہنچ گیا۔ جب پیار سے، جھک کر بات نہ بنی تو وہ بھی اکڑ گئی۔ وہ کون سا کسی بھی لحاظ سے راکیش سے کم تھی۔ نہ تو اس سے کم پڑھی لکھی تھی اور نہ ہی اس سے کم کماتی تھی۔ دونوں کے خاندان بھی برابر کی چوٹ کے تھے۔ ایک بار بات بگڑی تو بگڑتی چلی گئی۔ راکیش سے طلاق لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مگر اُس کی دو کمزوریوں نے اسے یہ قدم اُٹھانے نہ دیا۔ ایک تو وہ اپنے دل کے مریض باپ کو کوئی صدمہ نہیں دینا چاہتی تھی دوسرے اپنی بیٹی کو باپ کی شفقت سے محروم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک چھت کے نیچے دو اجنبیوں کی طرح رہتے وہ اپنی اپنی زندگی گزارنے لگے۔ بیٹی کے پیار کا سہارا اُس کے لیے کافی تھا اُسے ایک اچھا انسان بنانا اُس کی زندگی کا مقصد بن گیا۔

آنچل نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اُنہیں ایسا ہی پایا تھا۔ اس کی بھی خواہش

ہوتی کہ اس کے ماں باپ بھی دوسرے بچوں کے ماں باپ کی طرح پیار سے گھل مل کر رہیں۔ دکھاوے کی چاہت وہ بھی سمجھنے لگی تھی۔ ایک بار ننھے سے دماغ میں ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے بھی بیمار ہونے کا ڈھونگ رچایا۔ اس کی حالت دیکھ کر دونوں تڑپ اٹھے۔ پریشانی کے عالم میں دونوں اپنی نفرت بھول گئے۔ شاملی بیٹی کی تڑپ دیکھ کر رو رہی تھی اور راکیش اسے دلاسا دے رہا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے۔ سارے ٹیسٹ ٹھیک نکلے۔ اس کے سست، بجھے بجھے اور لگاتار پیٹ میں درد کا پتا نہ چل سکا۔ کچھ بیماری ہوتی تو پتا چلتا آخر ڈاکٹر اسی نتیجے پر پہنچے کہ:

''بچی کسی ذہنی اُلجھن کا شکار ہے۔ آپ دونوں اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاریں۔''

دونوں بچی کی صحت اور خوشی کے لئے آپس کی کڑواہٹ بھول گئے۔ کچھ دن اچھے کٹ گئے۔ مگر جب آنچل دوبارہ اپنے اصلی روپ میں آ گئی تو وہ دونوں بھی اپنی اصلیت پر آ گئے۔

بیٹی جب جوان ہوئی اور اپنی پڑھائی مکمل کر لی تو اس کی شادی کی فکر ماں کو ستانے لگی۔ ان لوگوں نے ایک دو جگہ بات بھی چلائی مگر وہ شادی کے لیے راضی نہیں ہو رہی تھی۔

''مجھے شادی جیسے رشتے میں کوئی دلچسپی نہیں، میں گھٹ گھٹ کر زندگی نہیں گذار سکتی۔'' اس نے ماں کو صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''ہر شادی ناکامیاب تو نہیں ہوتی، اگر دل مل جائے اور جیون ساتھی پیار اور قدر کرنے والا ہو تو اس جیسا خوبصورت بندھن اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔''

''ماں تم نے بھی تو ساری عمر اپنے ارمان مار کی ہی گذار دی۔ پڑھی لکھی ہو اپنے پیروں پر کھڑی ہو اپنی زندگی، جی سکتی تھیں۔ پھر......؟''

''اگر میں اپنے بارے میں سوچتی تو تمہیں صرف ماں یا باپ کا پیار ہی ملتا دونوں کا نہیں۔ اب تمہاری شادی ہو جائے گی تم اپنے گھر میں رچ بس جاؤ گی تو میں تمہارے پاپا

سے طلاق لے کر اپنی زندگی گزار دوں گی۔''

''اگر میری قسمت بھی تم جیسی ہوئی تو؟''

'ایسا نہیں سوچتے۔ میں نے اتنے بھی بُرے کرم نہیں کیے ہوں گے کہ اب اولاد کا دکھ بھی دیکھوں۔''

رشتہ مل ہی گیا۔ راکیش تو نہیں چاہتا تھا کہ بیٹی کو اسی شہر میں بیاہے مگر اتنا اچھا رشتہ چھوڑنا بھی عقلمندی نہ تھی۔ لڑکے والوں کے سامنے، دونوں نے اتنی میٹھی میٹھی باتیں کیں کہ انہیں شک بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ ان کے آپس کے رشتے کھٹے ہیں۔ حالانکہ آنچل اس بات کے خلاف تھی۔

''پاپا یہ لوگوں کے سامنے ڈرامہ ٹھیک نہیں۔ یہ کون سا ایک دو دن کی بات ہے کل کو جب سچ سامنے آئے گا تو میں کیا جواب دوں گی؟''

''تجھے بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں بیٹا۔ ابھی رشتہ کچا ہے اس لئے ہم کوئی چانس نہیں لینا چاہتے کل کو جب تیرے پیر اپنے نئے گھر میں جم جائے گے تو ہم خود سب سچ بتا دیں گے۔''

کہنا جتنا آسان تھا کرنا اُتنا ہی مشکل۔

نئے رشتے جڑے۔ اُن کا آنا جانا بھی بڑھا۔ پھر آنچل پرنو کے ساتھ بیاہ کر اپنے گھر کی ہوگئی۔ ایک ہی شہر میں رہتے تھے اس لیے آنا جانا لگا رہتا۔ داماد کے سامنے بھی دونوں گھل مل کر ہنس ہنس کر آپس میں باتیں کرتے۔

شاملی اب یہ روز روز کا ڈرامہ کر کے تھک چکی تھی۔ وہ جلد سے جلد اس رشتے کی گھٹن سے آزاد ہونا چاہتی تھی مگر گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ اور بھی مشکل ہوتا گیا اور اُس روز رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی۔ جب شادی کے تقریباً چھ ماہ بعد ایک رات اچانک اکیلی روتی روتی آنچل ماں باپ کے گھر آئی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر ماں تڑپ اُٹھی۔ باپ نے دیکھتے ہی پوچھا۔

''سب ٹھیک تو ہے نہ؟''

''نہیں۔ اب میں واپس اس گھر میں نہیں جاؤ گی۔ میں نہیں رہ سکتی ایسے آدمی کے ساتھ۔''

دونوں اسے اندر لے آئے۔ پانی پلایا، اسے چپ کرایا جب وہ تھوڑا سنبھلی تو اس سے جھگڑے کی وجہ پوچھنے پر اس نے سب بتا دیا۔ ناراضگی اور لڑائی کی وجہ جان کر دونوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''یہ تو بہت معمولی معمولی باتیں ہیں کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ حل نہ ہو سکے۔ دونوں مل کر آپس میں بات کرو تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔'' ماں نے سمجھایا۔

''مگر ماں ہر بات پر میں ہی کیوں سمجھوتہ کروں، میں اس سے کس بات میں کم ہوں؟ اسے بھی تو سمجھنا چاہیے۔ اڈجسٹمنٹ اسے بھی تو کرنی چاہیے۔ جتنی ضرورت مجھے اس کی ہے اسے بھی تو ہونی چاہیے۔''

''اس طرح اکڑ کر زندگی میں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تمہیں خود کو اس کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔'' ماں نے پھر سمجھایا۔

''چلو میں ابھی تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے سسرال سے آنے کا۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔ اگر آپ نہیں چاہتے تو میں کہیں اور چلی جاؤں گی مگر وہاں نہیں جاؤں گی۔''

''اس طرح زندگی نہیں کٹتی۔'' ماں نے پھر زور دے کر کہا۔

''کیسے نہیں کٹتی؟ آپ دونوں نے بھی تو کاٹی ہے، میں بھی کاٹ لوں گی۔''

''ہماری بات چھوڑو۔ تم اپنی بات کرو۔''

''آپ کی بات کیوں چھوڑوں۔ آپ تو مجھے تب حالات سے سمجھوتہ کرنے کو کہو جب آپ دونوں میں اڈجسٹمنٹ ہو جائے۔ نصیحت دینا آسان ہے اس پر عمل کرنا بہت

مشکل۔ اگر آپ دونوں ایڈجسٹ ہو کر دکھا دو تو میں سسرال میں جا کر ہر طرح سے خود کو اڈجسٹ کر لوں گی۔ آپ کو شکایت کا ایک بھی موقعہ نہیں دوں گی۔ اب مرضی آپ کی۔''

اتنا کہہ کر وہ وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دونوں لاجواب اک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ خاموشی شاملی ہی نے توڑی۔

''اب کیا ہوگا؟ میری بچی کا گھر تو اجڑ جائے گا۔''

بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''چپ ہو جاؤ شاملی، وہ صرف تمہاری نہیں میری بھی لاڈلی ہے جو سوچنا ہے مل کر سوچیں گے۔''

''دنیا کے آگے تو ڈھونگ کر سکتے ہیں مگر اپنی اولاد کو کیسے دھوکا دے سکتے ہیں۔ پہلے تو وہ بچّی تھی مگر اب تو اس نے دنیا دیکھی ہے۔''

''سوچتے ہیں اس بارے میں۔ مجھے یقین ہے کچھ نہ کچھ حل نکل ہی آئے گا صبح بات کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ادھر آنچل اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے موبائل پر پرنو سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے تیر نشانے پر لگا ہے۔ لگتا ہے تمہاری سکیم کامیاب ہو جائے گی۔''

''اگر ہو گئی تو کیا انعام دو گی''؟ اس نے شوخی سے پوچھا۔

''منہ مانگا انعام دوں گی۔'' جو تم کہو''۔

''مکر مت جانا۔''

''آزما کر دیکھ لینا۔ جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔''

ماں باپ کی نیند اُڑا کر خود دونوں رات دیر تک محبت بھری باتیں کرتے رہے۔

☆☆☆